تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

بانو قدسیہ کے ناول شہر لازوال ،آباد ویرانے میں ہندو مسلم تہذیب وثقافت کی عکاسی

محقق

مریم جمیل

216-FLL/MSURDU/S17

نگران

ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

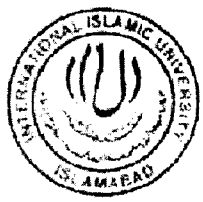

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No. TH 3134

MS
891.4393
م رب

اردو ادب ۔ ناول

تہذیب و ثقافت ۔ بیرہ فیر

الجامعة الإسلامية العالمية
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ مریم جمیل رجسٹریشن نمبر 216-FLL/MSURDU/S17 نے ایم۔ایس۔ اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"بانو قدسیہ کے ناول شہر لازوال ،آباد ویرانے میں ہندو مسلم تہذیب وثقافت کی عکاسی"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر شیراز فضل داد
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Maryam Jamil**
Title of the Thesis: بانو قدسیہ کے ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کی عکاسی
Registration No: **216-FLL/MSURD/S17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:
Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:
Dr. Abdul Aziz Sahir
Professor
AIOU University, Islamabad

Internal Examiner:
Dr. Bibi Ameena
Lecturer
Department Of Urdu, IIUI,
Islamabad

Supervisor:
Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor,Department Of Urdu
Female IIUI

786
12/12/2019

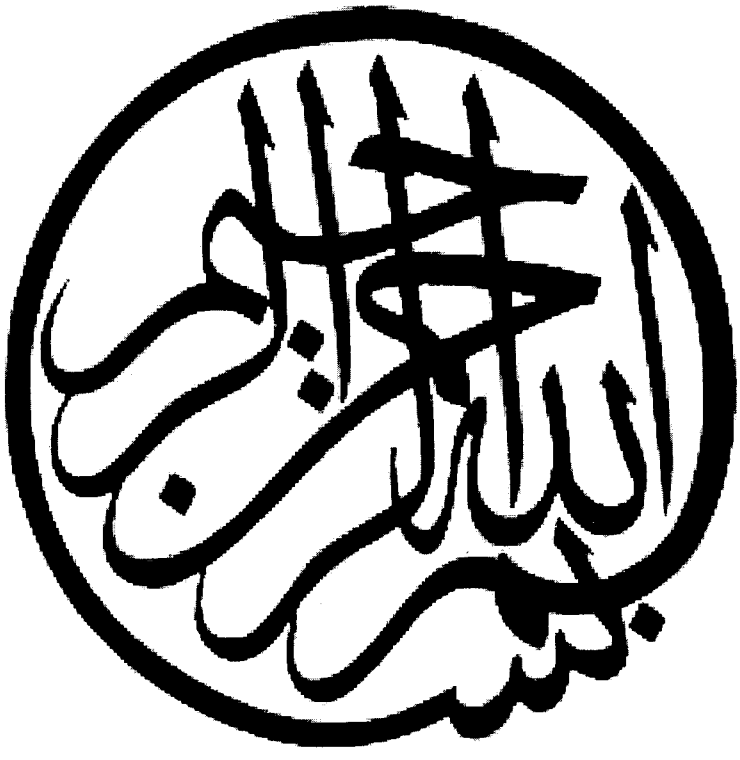
بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

تحقیقی مقالے کے لیے موضوع کا انتخاب کرنا ہر چند آسان کام نہیں موضوع کے انتخاب کے لیے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے-ناول سے ذاتی دلچسپی کی بنا پر میں نے اس صنف ادب کو تحقیقی موضوع کے طور پر منتخب کیا اور تحقیقی خاکے کی تیاری کے لیے بانو قدسیہ کے آخری ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کا انتخاب کیا-اس ناول کو پڑھ کر ڈاکٹر حمیرا اشفاق سے خاکے کے بارے میں بات کی کہ ناول کا غالب عنصر ہندو مسلم تہذیب و ثقافت ہے ڈاکٹر صاحبہ نے مشورہ دیا کہ ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کو ہی ناول کا عنوان تجویز کیا جائے اور اسی کے مطابق سوالات تحقیق بنائے جائیں یوں ڈاکٹر حمیرا اشفاق کی رہنمائی میں **"بانو قدسیہ کے ناول میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کی عکاسی"** کو بطور موضوع منتخب کیا اور تحقیقی خاکہ تیار کیا-باوجود اس کے بانو قدسیہ پر بے شمار تحقیقی و تنقیدی کام منظر عام پر آچکا ہے لیکن آج بھی بانو قدسیہ کے ناولوں کو تحقیقی کام کے لئے منتخب کیا جاتا ہے-

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے اور ناول ایسی صنف ادب ہے جس میں کسی بھی عہد کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہیں- شہر لازوال، آباد ویرانے ایک ایسا ناول ہے جس میں بانو قدسیہ نے اپنے سماج اور تہذیب و ثقافت کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے-زیر بحث ناول ایک مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی کہانی ہے بانو قدسیہ نے اس ناول میں اخذ و انجذاب، مذہبی تعصب، قیام پاکستان کے حالات، فسادات، ہجرت کا کرب، سماجی مسائل اور تہذیبی و ثقافتی شکست و ریخت ان تمام موضوعات کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا -مقالے کا خاکہ تیار کرتے وقت ذہن میں ان تمام نکات کو رکھ کر زیر نظر مقالے کے خاکے کی تیاری مکمل ہوئی-ناول کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا-ناول کا پہلا باب تہذیب و ثقافت کا تعارف اور نظری مباحث ہے- اس باب میں مختصراً تہذیب و ثقافت کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور مشرقی و مغربی مفکرین کے کلچر کے بارے میں نظریات بھی بیان ہوئے ہیں نیز ہندو مسلم کلچر کی مختصراً وضاحت بھی پیش کی گئی ہے-اس باب کو تحریر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تہذیب و ثقافت کا تعارف کروانے کے بعد ہی ہندو مسلم تہذیب و ثقافت پر بات کی جائے-باب دوم میں ناول کے کرداروں کے رویوں میں تہذیبی و ثقافتی اظہار کو بیان کیا گیا ہے- ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں اور کثیر المذاہب کرداروں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھ مذہب اور اینگلو انڈین کرداروں کا تہذیبی و ثقافتی لحاظ سے جائزہ لینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے- اس باب میں کرداروں کے ہاں تہذیبی اور ثقافتی اظہار کو پیش کرتے وقت ہندوستانی تہذیب و معاشرت رسم و رواج اور تہذیب کے مختلف مظاہر

کو ناول میں موجود کرداروں کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا گیا ہے-زیر بحث مقالے کے تیسرے باب میں ناول کی کہانی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کی شکست و ریخت کی مختلف صورتوں کو بیان کیا گیا ہے-شکست و ریخت کی مختلف صورتوں کو بیان کرتے ہوئے جدید پاکستانی معاشرے اور قدیم برصغیر پاک وہند کے مخلوط معاشرے میں پائی جانے والی سماجی برائیوں اور معاشرتی مسائل، تقسیم کا واقعہ، فسادات، ہجرت کا کرب، جنسی بے راہ روی، مذہبی تعصب اور اخذ و انجذاب کی مختلف صورتیں اس باب میں پیش کی گئی ہیں-چوتھے باب میں ناول کی زبان کے اظہار میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کے مباحث اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے-ماحصل میں خاکے میں درج تمام سوالات کے نتائج مرتب کیے گئے ہیں-

زیر نظر مقالہ ڈاکٹر شیراز فضل داد کی زیر نگرانی تحریر کیا گیا ڈاکٹر صاحبہ نے مطالعہ کے لیے اپنی ذاتی کتب فراہم کیں اور ٹیلیفون پر بھی رابطہ قائم رکھا اپنا قیمتی وقت عنایت کرنے پر میں ان کی شکر گزار ہوں-ڈاکٹر نجیبہ عارف اور ڈاکٹر غلام فریدہ ہمارے شعبے کی نہایت شفیق اساتذہ کرام ہیں انہوں نے ہر مرحلے پر اپنی خصوصی توجہ سے نوازا-ان اساتذہ کرام کی شفقت کی وجہ سے ہی منزل مقصود تک رسائی ممکن ہو سکی ہے-عزیز دوست افشین جاوید عمارہ علی اور ماریہ امجد نے استاد نہ ہوتے ہوئے بھی استاد ہی کی طرح مقالے کی سپردگی تک ہر قدم پر اپنے علمی مشوروں سے نوازا ان کے لئے میرے جذبات الفاظ میں سموئے نہیں جاسکتے-

اللہ تعالی کی مدد کے بغیر اس مقالے کو پایا تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تھا-میں اللہ رب العزت کی بے حد شکر گزار ہوں ان کے فضل وکرم کی وجہ سے میں نے منزل مقصود تک رسائی حاصل کی-اللہ تعالی کی ذات کے بعد میں اپنے والد کی کاوشوں کے لیے بے انتہا ممنون ہوں والدہ کی وفات کے بعد وہ ہمارے لئے ہمیشہ آسانیاں مہیا کرتے رہے-ان کے بخشے ہوئے اعتماد اور پیار کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے-اپنے پیارے ابو کے لیے اتنا ہی کہنا چاہوں گی!

اپنی تکمیل کے عناصر سے
آپ کو گر نکال دوں ابو
زندگی کی کتاب کے سارے
حرف و معنی بکھرنے لگتے ہیں
ہر کہانی اجڑنے لگتی ہے
کچھ بھی رہتا نہیں ہے پھر باقی
سب کے سب رنگ اڑنے لگتے ہیں

اللہ کی پاک ذات ہماری والدہ کی مغفرت کرے اور والد صاحب کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے آمین-

عنوان کی منظوری کے مراحل سے لے کر مقالے کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں میرے شریک حیات عثمان علی نے قدم قدم پر میرا بھرپور ساتھ دیا-گھریلو ذمہ داریوں سے فراغت بخشی اور میرے لئے حتی المقدور آسانیاں فراہم کیں- تحقیقی سفر کے دوران میری راہ میں آنے والی ہر مشکل کو دور کیا ان کے تعاون کے بغیر مقالے کی تکمیل ناممکن تھی-انہوں نے مقالے کے تمام تکنیکی مراحل کمپوزنگ پروف ریڈنگ کے بعد مقالے کو منظم شکل دی-ان کی اس محنت کو کسی شکریہ کے لفظ سے چکانا ممکن نہیں میں ان کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے میرے لیے یہ گنجائش پیدا کی کہ میں اپنی ڈگری مکمل کر سکوں-اپنی چھوٹی بہن زہرا جمیل کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جس نے بچپن سے لے کر آج تک ہر دشوار مرحلے میں میرا بھرپور ساتھ دیا ہمیشہ میرے لئے آسانیاں فراہم کرتی رہی-نیشنل بک فاؤنڈیشن، اکادمی ادبیات پاکستان، نیشنل لائبریری اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، کنٹونمنٹ لائبریری، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے نگران کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے کتب تک رسائی فراہم کی-

مریم جمیل

اکتوبر ۲۰۲۰ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	تہذیب و ثقافت کا تعارف اور نظری مباحث	۱
۲۔	**باب دوم:**	
	کرداروں کے رویوں میں تہذیبی و ثقافتی اظہار	۲۳
۳۔	**باب سوم:**	
	شہر لازوال، آباد ویرانے کی کہانی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کی شکست و ریخت کا تجزیاتی مطالعہ	۶۸
۴۔	**باب چہارم:**	
	ناول کی زبان کے اظہار میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کے مباحث اور تجزیہ	۱۰۷
	ماحصل	۱۳۹
	کتابیات	۱۵۸

باب اوّل:

تہذیب و ثقافت کا تعارف اور نظری مباحث

باب اوّل:

تہذیب و ثقافت کا تعارف اور نظری مباحث

لغات میں تہذیب و ثقافت کی مختلف تعریفیں بیان ہوئیں ہیں۔فرہنگ آصفیہ میں تہذیب کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے:

تہذیب(ع)اسم مونث:(۱) آراستگی،صفائی پاکی،درستی،اصلاح

(۲) شائستگی،خوش اخلاقی،اہلیت،لیاقت،آدمیت،تربیت،انسانیت،شرافت[۱]

قاموس مترادفات میں تہذیب کے درج ذیل معنی بیان کیے گئے ہیں:

تہذیب اصلاح،درستگی،شاخ تراشی،شائستگی،ثقافت،خوش اخلاقی،آدمیت،پاکیزگی،صفائی،اہلیت اور لیاقت کو کہتے ہیں۔[۲]

لسان العرب میں لفظ ثقافت کی اصل "ثقف" ہے جس کے معنی ذہین،صاف ستھرے اور مہذب ہونے کے ہیں۔[۳]

مصباح اللغات میں ثقافت کے معنی زیرک،نیک اور چالاک ہونے،کامیاب ہونے،فتح مند، پالینے اور جلدی سے سمجھ لینے کے ہیں۔[۴]

لغات میں تہذیب و ثقافت کے معنی دیکھ کر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ تہذیب کا تعلق خارجی چیزوں یعنی طرز عمل خوش اخلاقی،اطوار،گفتار،کردار وغیرہ سے ہوتا ہے جبکہ ثقافت کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو ہمارے ذہن سے جڑی ہوتی ہیں یعنی ہماری ذہنی صفات علوم وفنون وغیرہ۔تاہم دنیا کی تمام لغات میں سے بھی اگر کلچر کی تعریف پیش کی جائے تو کلچر کی ایسی کوئی جامع ومانع تعریف ہے ہی نہیں جس میں کلچر کی واضح تصویر موجود ہو۔

تہذیب کا تعلق ظاہری چیزوں سے ہے اٹھنا بیٹھنا،رہن سہن،اخلاق وعادات یہ تہذیب کے زمرے میں آتے ہیں ثقافت کا تعلق ذہنی صلاحیتوں سے ہے۔جمیل جالبی تہذیب اور ثقافت کے مابین فرق کو بیان کرتے ہوئے تہذیب کو خارجی چیزوں اور طرز عمل جس میں گفتار کردار اور خوش اخلاقی قابل ذکر ہیں میں شامل کرتے ہیں جبکہ ثقافت کا تعلق ذہنی صفات جس میں علوم وفنون شامل ہیں سے بتاتے ہیں۔[۵]

تہذیب اور ثقافت کے الفاظ عام طور پر اکٹھے استعمال ہوتے ہیں اور بعض اوقات انہیں ایک دوسرے کے

متبادل کے طور پر بھی لیا جاتا ہے بہر حال دونوں کے مابین فرق ضرور موجود ہے۔ ثقافت کسی بھی معاشرے کی وہ اقدار ہیں جن میں مذہب اور رسم و رواج وغیرہ شامل ہیں اور یہ اقدار بغیر کسی تبدیلی کے معاشرے میں رائج ہوتی ہیں جبکہ تہذیب کا تعلق ان اقدار سے ہے جن کے اندر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب کا تعلق خارجی چیزوں سے جبکہ ثقافت کا تعلق داخلی خصوصیات سے ہے۔

فیض احمد فیض تہذیب اور کلچر کے فرق کے بارے میں کہتے ہیں کہ میرے خیال میں ان کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ فیض احمد فیض تہذیب کو کلچر ہی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کلچر اور سولزیشن کو الگ کرنا چاہیں تو کلچر طرز زندگی کا نام ہے اور اس کی جو متشکل مختلف قسم کی صورتیں ہیں ان کو فیض سولزیشن کہتے ہیں۔[6] ڈاکٹر سلیم اختر تہذیب اور ثقافت کے فرق کو دریا اور اس کی لہروں سے تشبیہ دے کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ تہذیب ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ دریا کے بہاؤ کی مانند ہے تہذیب ایک ایسا دریا ہے جس کا منبع کہیں دور ماضی بعید کی تاریکی میں پنہاں ہے اور اسی دریا کے مختلف مقامات پر ابھرتی اور ڈوبتی لہریں کلچر ہیں۔[7] تہذیب اور ثقافت کا آپس میں رشتہ دریا اور اس کی لہروں کی طرح گہرا ہے لیکن ثقافت کسی بھی صورت میں لہر ہی رہے گی۔ تہذیب و ثقافت کی اساس ایک ہی ہے سجاد باقر رضوی کا اس بارے میں کہنا ہے:

> تہذیب کا لفظ ثقافت کا مترادف بنتا جا رہا ہے مگر جس طرح اصل اور بہروپ میں حقیقت اصلی اور بہروپ لحاتی ہوتا ہے اسی طرح تہذیب بھی ثقافت کا بہروپ ہے۔۔۔۔۔ اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے، آداب، خورد و نوش، گفتگو کا پر تکلف انداز فیشن، عریانی اور فحاشی اس کے نمایاں خدوخال ہیں اسی تہذیب کو کلچر کے نام سے فنون لطیفہ اور خاص طور پر ادب میں پیش کیا گیا ہے۔[8]

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب کلچر کے خدوخال میں کلچر اور تہذیب کے فرق کو ڈی۔ ایس سیوج کے بقول بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق کلچر اور تہذیب کے مابین ہے۔[9] ماہرین سماجیات تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ ہیں۔

اردو میں تہذیب کو جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس میں اصلاح، صفائی، آراستگی، شائستگی، تمیز، طرز معاشرت رہنے سہنے کا انداز، تمدن ترقی اور درستگی شامل ہیں ان تمام مفاہیم میں تہذیب کا تعلق معاشرتی زندگی سے بتایا گیا ہے جبکہ تہذیب کا تعلق نہ صرف معاشرتی زندگی بلکہ اخلاقی اور روحانی رویوں سے بھی ہے۔ مصوری، خطاطی شاعری اور تمام علوم و فنون بھی کلچر ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ ماہرین نے تہذیب کے جو مظاہر بیان کئے ہیں ان

میں سے ایک تو مادی مظاہر ہیں اور دوسرے غیر مادی۔ غیر مادی مظاہر کو ذہنی مظاہر بھی کہا جاتا ہے۔ مادی مظاہر میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جنہیں انسان اپنے حواس کی مدد سے دیکھ سکتا ہے ان میں آلات واوزار، موسیقی کے آلات، آمدورفت کے ذرائع، ملبوسات، عمارات، برتن وغیرہ شامل ہیں۔ رسوم ورواج، آداب، اخلاق واقدار روایات کا تعلق غیر مادی مظاہر سے ہے علاوہ ازیں خوشی غمی کی رسومات اقدار کھیل اور موسیقی وغیرہ بھی تہذیبی عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔

کلچر ایک مختلف المعنی اصطلاح ہے اس کی ہر دور ہر ملک ہر زبان اور ہر شعبے میں الگ الگ تعریفیں بیان کی گئی ہیں حیاتیات، بشریات، نفسیات، تاریخ اور سوشیالوجی میں کلچر پر طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ ایک ماہر بشریات مالنوسکی کے کلچر کے سائنٹیفک نظریے کا ترجمہ و مفہوم ہے کلچر میں اوزار ہتھیار دستور نامے صناعات عقائد رسم ورواج انسانی افکار اور صارفین کی کل اشیاء شامل ہیں۔[10]

انسائیکلوپیڈیا کے مطابق کلچر کی تعریف ہے:

> It is instructive to note that word civilization is by no means an old one.Boswell reports that the urged Johnson to insert the term in his dictionary in 1772, but Johnson refused.He preferred the older work "civility".This, life "urbanity", reflects the contempts of the towns man for the rustic or the barbarian; it is an invidious term, although in the way justified by the fact that only where cities have grown up have men developed intricate civilization.[11]

مغربی ماہرین نے تہذیب کے متعلق اپنی مختلف آراء پیش کی ہیں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں میں سولزیشن کو civility کی اصطلاح کی جدید صورت قرار دیا گیا اس کے مطابق انسانوں کے ایک گروہ کی صورت میں زندگی بسر کرنے کے طریقہ کار کا نام تہذیب ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی تعریف کے مطابق تہذیب کسی بھی معاشرے کے رہن سہن اور عادات واطوار کا نام ہے جبکہ تہذیب کے جدید مفہوم میں نہ صرف معاشرتی زندگی بلکہ اخلاقی رویے بھی شامل ہو چکے ہیں لہذا اس تعریف کو حتمی تعریف نہیں سمجھا جاسکتا۔ اہل مغرب نے تہذیب کی مختلف النوع تعریفیں پیش کی

ہیں-ریمنڈ ولیمز کہتا ہے لفظ کلچر انگریزی زبان کے چند پیچیدہ ترین الفاظ میں سے ایک ہے-[12]

کلچر لاطینی زبان کے لفظ Cultura سے مشتق ہے جس کا مادہ Colere ہے- Colere کثیر المعنی لفظ ہے، اس کے متعدد معنی میں Inhabit , Cultivate ,Protect اور Honour with worship شامل ہیں اور Cultura ان میں سے Tending Cultivation کے مفہوم پر مبنی ہے- [13]لپ بیگ بی نے کتاب کلچر اینڈ ہسٹری (۱۹۵۸ء) میں لکھا اس لفظ کا استعمال اٹھارہویں صدی میں فرانسیسی مصنفین Voltair اور Vanvenargue نے کیا- ان کے نزدیک ذہنی تربیت و تہذیب کا نام کلچر تھا- جلد ہی اچھے آداب، آرٹ، سائنس اور تعلیم وغیرہ بھی اس میں شامل ہو گئے-[14]

کلچر کے معنی میں ہر دور میں وسعت آتی گئی اور انیسویں صدی کے وسط میں پہلی بار ایک ماہر بشریات سر ایڈورڈ برنیٹ ٹائلر نے کلچر کو بطور اصطلاح اپنی کتاب *Primitive Culture* میں استعمال کرتے ہوئے اس لفظ کی تعریف بھی بیان کی-[15] ایڈورڈ ٹائلر کے بعد متعدد دانشوروں اور ماہرین نے کلچر کی مختلف تعریفیں بیان کیں لیکن یہ تعریفیں کچھ حد تک آپس میں مماثلت بھی رکھتی تھیں اور بعض تعریفوں میں تضاد بھی پایا جاتا لیکن کلچر کی کوئی باقاعدہ تعریف متعین نہیں کی جا سکی اس کے معنی میں ہر دور میں ابہام پایا گیا-

الفریڈ کروبر اور کلائیڈ کلک ہون دو امریکی ماہرین بشریات نے ۱۹۵۲ء میں جب کلچر کا جائزہ لینے کے لیے ۶۰۰ کتب کا جائزہ لیا تو آدھی سے زائد کتابوں میں تو کلچر کی تعریف ہی موجود نہیں تھی اگر کوئی تعریف موجود تھی بھی تو وہ غیر واضح اور مبہم ہوتی تھی-[16] ماہرین ایک صدی سے کوششیں کر رہے تھے لیکن ۱۹۹۰ء تک کلچر کی کوئی واضح تعریف پیش کرنے میں ناکام رہے- کلچر کی تعریف میں جو ابہام پایا جاتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کلچر اور سولائزیشن کو آپس میں غلط ملط کر دیا گیا ہے الفریڈ کروبر نے کلچر اور سیولائزیشن کو ایک قرار دینے کی روش کو اپنایا اور اس کا نظریہ ہے کی یہ ایک ہی چیز کے مختلف درجے ہیں-

Kelvin Avruch اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> میتھیو آرنلڈ نے قرار دیا کہ کلچر خصوصی علمی اور فنکارانہ کوششوں یا ان کے نتیجے سے تعلق رکھتا ہے، جسے آجکل 'عوامی کلچر' کے مقابلے میں 'ہائی کلچر' کہا جا سکتا ہے- آرنلڈ کی تعریف کے مطابق کسی سماجی گروہ کا محض ایک محدود حصہ ہی تہذیب یافتہ کہلا سکتا ہے- ایڈورڈ ٹائلر کی بیان کردہ تعریف کسی حد تک آرنلڈ کی تعریف کا جواب تھی- ٹائلر کے مطابق تمام سماجی گروہوں کے سارے افراد کلچر کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں- ٹائیلر کی تعریف کے مطابق عامتہ الناس بھی کلچر رکھتے ہیں جسے وہ

کسی معاشرے کے فرد کی حیثیت سے حاصل کرتے ہیں- بیسویں صدی میں فرانز بوس نے کلچر کا تیسرا مفہوم پیش کیا جو ٹائلر کے رد عمل میں سامنے آیا- بوس نے مختلف لوگوں اور معاشروں کے متعدد متنوع الاقسام کلچروں کی انفرادیت پر زور دیا ہے- بوس نے 'ہائی' اور 'لو' کلچر کے تصور کو مسترد کرنے کے علاوہ کلچر کو وحشی اور متمدن کے پیمانے سے ناپنے سے بھی انکار کر دیا-[۱۷]

کلچر کے ان مختلف مفاہیم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے کلچر کے بارے میں متنوع تصورات پیش کیے جاتے رہے ہیں- ٹائلر نے تہذیب یا کلچر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

وسیع بشریاتی مفہوم میں تہذیب یا تمدن ایسا پیچیدہ کل ہے جس میں معلومات، عقائد، فن، اخلاقیات، قوانین، رسوم و رواج اور ایسی کوئی بھی استعداد اور عادات پائی جائیں جو فرد نے بطور رکن معاشرہ حاصل کی ہوں-[۱۸]

ٹائلر کی اس تعریف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ کلچر اور سولزیشن کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی چیز شمار کرتا تھا ٹائلر سے قبل کلچر کو اصطلاح شمار نہیں کیا جاتا تھا پہلی بار ٹائلر نے ہی اس کو ایک اصطلاح کا درجہ دیا- اس تعریف سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ٹائلر کلچر میں علوم و فنون عقائد رسم و رواج قوانین اور ان تمام چیزوں کو شامل کرتا ہے جو ایک انسان معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے اپناتا ہے- ٹائلر کی بیان کردہ درج بالا تعریف آج بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے—

آج کل کلچر کے مظاہر کو بھی کلچر ہی سمجھ لینے کا رجحان عام ہے مثال کے طور پر آرٹ کو کلچر ہی سمجھا جاتا ہے جبکہ آرٹ کلچر کا محض ایک جز ہے ایلیٹ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ لوگ آرٹ، معاشرتی نظام، رسوم، مذہب وغیرہ کو کلچر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں کلچر نہیں بلکہ وہ کچھ ہیں جن سے کلچر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے-[۱۹] رسوم و رواج، روایات، قوانین، کو اگر انفرادی طور پر اپنایا جائے تو اس کا شمار کلچر کے ذیل میں نہیں آئے گا ان اقدار و روایات کو بغیر کسی جبر کے معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر باقاعدگی سے لاگو کر لیں تبھی اس کا شمار کلچر کے ذیل میں کیا جائے گا-

اردو تصنیفات میں تہذیب کی اصطلاح کا اولین بار ذکر تذکرہ گلشن ہند (۱۸۰۱ء) میں ملتا ہے- ۱۸۰۵ء میں مولوی عنایت اللہ نے ایک کتاب اخلاق جلالی کا ترجمہ جامع الاخلاق نام سے کیا- ڈاکٹر جانسن کی کتاب تواریخ راسلس کا ترجمہ کبیر الدین حیدر عرف محمد میر لکھنوی نے کیا اور اس کے دیباچے میں لکھا کہ "زبان اردو میں ترجمہ کیا کہ صاحبان فہم و فراست کو تہذیب اخلاق بخوبی ہو" (مطبوعہ آگرہ ۱۸۳۹ء)-[۲۰]

سبط حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء میں ان صاحب علم و فراست کے ہاں تہذیب کا وہی پرانا تصور بتاتے ہیں جو فارسی زبان میں رائج تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ سر سید احمد خاں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے تہذیب کا نظریہ ایک الگ طریقے سے پیش کیا اور تہذیب کے عناصر ترکیبی پر بھی بات کی۔ سر سید تہذیب کا جدید مفہوم بیان کرتے ہوئے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کی پہلی اشاعت (۱۸۷۰ء) میں رقم طراز ہیں:

> سولزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہونچانا اور ان کو نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصل خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔[۲۱]

انیسویں صدی میں اہل مغرب کے ہاں کلچر اور سولائزیشن کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا سر سید احمد خان کے ہاں بھی ہمیں تہذیب اور کلچر میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا سر سید نے تہذیب اور کلچر کی ویسی ہی تعریف کی ہے جو انیسویں صدی میں مغرب میں رائج تھی۔ سر سید کے ہاں تہذیب کا یہ نظریہ مغرب سے آیا ہے اس کا اعتراف سر سید خود کرتے ہیں انہوں نے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں تہذیب کے عنوان پر دو مضامین "تہذیب اور اس کی تعریف" اور "سولائیزیشن یعنی شائستگی اور تہذیب" لکھے یہ مضامین لکھتے وقت سر سید نے ٹامس بکل کی کتاب سے اکتساب کیا۔ سر سید احمد خان سولزیشن کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان کی حاجتیں، ان کی غذائیں اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لئے برائی اور اچھائی کے خیالات بھی یکساں ہوتے ہیں اور برائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔[۲۲]

سر سید کے بیان کردہ تہذیب کے جدید مفہوم سے تہذیب کی یہ تشریح ہوتی ہے کہ کسی گروہ یا معاشرے کی وہ اجتماعی عادتیں جو ان کی زندگیوں کا حصہ بن گئیں ان عادتوں کے ساتھ ساتھ اس گروہ کے خیالات اور عقائد بھی تہذیب کا حصہ ہیں۔

سر سید احمد خان نے آج سے سو سال پہلے تہذیب کے بارے میں جو نظریات پیش کیے وہ بالکل درست نظریات تھے ان تصورات سے تہذیب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے- سر سید احمد خان کے تہذیب کے بارے میں جو نظریات تھے ان پر ناقدین نے اعتراض بھی کیا ہے کہ انہوں نے سولزیشن اور کلچر کو آپس میں غلط ملط کر دیا ہے چونکہ سر سید نے مغرب سے یہ تصور مستعار لیا تھا اور مغرب میں بھی اس وقت تک ان کے مابین فرق نہیں کیا گیا تھا اہل مغرب بھی کلچر اور سولزیشن کو ایک ہی تصور قرار دیتے تھے اسی تصور کے پیش نظر سر سید نے بھی سولزیشن اور کلچر کی الگ الگ تعریف بیان کرنے کے بجائے تمام مادی اور غیر مادی پہلوؤں کو اکٹھا بیان کر دیا تھا-

مختلف محققین، ناقدین اور دانشوروں کی تہذیب کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں- ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں "تہذیبی" لفظ کو انگریزی لفظ کلچرل کے معنوں میں استعمال کیا ہے- کلچر کسی بھی معاشرے کی مشترکہ اقدار ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ معاشرہ ایک انفرادی تشخص رکھتا ہے- زبان، فکر، عادات و اطوار، مذہب، طرزِ معاشرت، عقائد، رسم و رواج، معاشرتی ادارے اور ان تمام چیزوں کے مجموعے کو جمیل جالبی کلچر کا نام دیتے ہیں- ہمارے معاشرے کے لوگوں کے ذہنوں میں آج بھی یہ سوال کلبلاتا ہے کہ کلچر کیا ہے؟ ہر دور میں اس دور کی ضروریات اور مختلف مواقوں پر کلچر کی مختلف تعریفیں پیش کی کی جاتی رہی ہیں ان مختلف الانوع تعریفوں کی وجہ سے کلچر کا مفہوم ابہام کا شکار ہو چکا ہے- کلچر کی کوئی واضح تصویر نہیں ہے یہ ہوا میں خوشبو کی مانند ہے جس کو ہم چھو تو سکتے ہیں لیکن دیکھ نہیں سکتے- کلچر زندگی کی بنیادی ضروریات کی طرح ایک اہم اور بنیادی چیز ہے لیکن جمیل جالبی بھی کلچر کی کوئی واضح تعریف جس سے تشنگی حاصل ہو جائے بیان کرنے سے قاصر ہیں-

ڈاکٹر جمیل جالبی کلچر کی وضاحت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کلچر کے لیے "تہذیب" اور "ثقافت" کے الفاظ مستعمل ہیں- لفظ تہذیب نہ صرف اردو زبان میں بلکہ عربی و فارسی زبان میں بھی مستعمل ہے- عربی زبان میں اس لفظ کے لغوی معنی درخت کو تراشنا، کاٹنا اور اس کی اصلاح کرنا- فارسی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں "آراستن و پیراستن"- پاک و درست و اصلاح نمودن- اگر مجازی معنی میں تہذیب کو دیکھا جائے تو شائستگی کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے- مثال کے طور پر کسی شخص کو یہ کہا جائے کہ وہ تہذیب یافتہ ہے تو اس سے اس کی مراد یہ ہو گی کہ وہ بول چال کے انداز، عادات و اطوار میں شائستہ مزاج رکھتا ہے- جمیل جالبی انسان کی ظاہری چیزوں جن میں معاشرت اور اخلاق شامل ہیں، کو تہذیب کا نام دیتے ہیں-

جس معنی میں تہذیب کا لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے عربی اور فارسی میں بھی انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے- اردو میں کلچر کے لیے ایک اور لفظ "ثقافت" بھی مستعمل ہے- جمیل جالبی کی لفظ ثقافت کے بارے میں یہ رائے

ہے کہ اس کا تعلق ہماری ذہنی چیزوں سے ہے۔ جمیل جالبی تہذیب و ثقافت دونوں الفاظ کو یکجا کر کے کلچر کا لفظ ان کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کلچر کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ زندگی کی تمام سرگرمیوں جن کا تعلق ذہنی ہو یا مادی، خارجی ہو یا داخلی، کلچر ان تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔[۲۳] کلچر کی باقاعدہ تعریف جمیل جالبی نے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> کلچر اس کل کا نام ہے جس میں مذہب و عقائد، علوم اور اخلاقیات، معاملات اور معاشرت، فنون و ہنر، رسم و رواج، افعال ارادی اور قانون، صرف اوقات اور وہ ساری عادتیں شامل ہیں جن کا انسان معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے اکتساب کرتا ہے۔[۲۴]

جمیل جالبی کلچر کے زمرے میں اور بھی بہت سی چیزوں جس میں زندگی کے مختلف مشاغل، اپنی روایات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا، غلط چیزوں کی اصلاح، معاشرت میں حسن بول چال میں نرمی، کو شامل کرتے ہیں۔

معاشرے میں کلچر کا وجود بہت اہمیت کا حامل ہے کلچر معاشرے کے لئے ہوا اور دوران خون کا درجہ رکھتا ہے۔ پہلے پہل انسان غاروں میں رہتا تھا تن ڈھانپنے کے لئے پتوں کا استعمال کرتا تھا۔ انسان نے اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے اپنے تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے بنائے، رہنے کے لئے عمارتیں بنائیں۔ اسی طرح ایک منظم معاشرہ وجود میں آیا اس معاشرے کے اصول و ضوابط متعین ہو گئے۔ پرامن اور شائستہ زندگی بسر کرنے کے لیے اقدار، رسم و رواج، اخلاقیات، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت غرض ہر شے کے طور طریقے اور ادب و آداب اپنائے۔ معاشرے کے اس مجموعی طرز زندگی کو جمیل جالبی کلچر کا نام دیتے ہیں۔

کسی بھی شے کو کلچر کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ انفرادی نہ ہو بلکہ اجتماعی ہو اور معاشرے میں یکساں طور پر رائج ہو اور اس سرگرمی میں باضابطگی پائی جائے۔ جمیل جالبی اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی ایک شخص گھر سے باہر قدم نکالتے وقت دایاں پاؤں باہر رکھتا ہے تو یہ اس کا انفرادی طرز عمل ہے لیکن اس معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر باہر نکلتے وقت ہمیشہ دایاں پاؤں باہر رکھیں تو یہ کلچر کے ذیل میں آئے گا۔ کھانا پکانے کے طریقے شادی بیاہ کی رسومات اور زندگی کی وہ تمام سرگرمیاں جن میں باضابطگی پائی جاتی ہے وہ کلچر کے زمرے میں آتی ہیں۔[۲۵]

سید عبداللہ اپنی کتاب کلچر کا مسئلہ میں تہذیب اور ثقافت کے لیے جمیل جالبی کی طرح کلچر کی اصطلاح اپناتے ہیں۔ اردو ادب میں کلچر کے لئے ثقافت، تہذیب اور کبھی کبھی تمدن کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے لیے متبادل بہت سی ترجمہ شدہ اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ لفظ کلچر میں پہلے سے بہت سے ابہام پائے

جاتے ہیں اور اس کے ترجمے کی وجہ سے مزید مسائل کا اضافہ ہو گیا ہے ترجمے کی وجہ سے کلچر کے حقیقی مفہوم تک رسائی مشکل ہو گئی ہے- ہر دور میں کلچر پر بہت طویل بحثیں کی گئی ہیں کبھی کلچر کو سولزیشن کے ہم معنی قرار دیا گیا اور کبھی اس سے مختلف معنوں میں- سید عبداللہ سولزیشن کو کلچر کی ترقی یافتہ اور وسیع تر شکل قرار دیتے ہیں-

کتاب کلچر کا مسئلہ میں سید عبداللہ کلچر کو کھانے پینے کے آداب، رہنے سہنے کے طریقے، میل جول کے آداب، رسم و رواج شادی بیاہ میلے تہوار مجلسی تفریحات، ذوقی مشاغل موسیقی، شعر گوئی، مصوری، شکار، کھیل ،پرندوں کی تربیت، آلائش زیبائش سے عبارت کرتے ہیں۔[۲۶] سید عبداللہ کلچر کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> لفظ کلچر میں تمام مجلسی ذوقی رویے اور تخلیقی عمل اور وہ تمام معاشرتی عادات شامل ہو جاتی ہیں جو آزادانہ رضاکارانہ ظہور میں آتی ہیں جن میں قانونی طور پر جبر موجود نہیں ہوتا۔[۲۷]

کسی جبری قانونی منصوبہ بندی کے بغیر خوش دلانہ طور پر افراد کے اندر ایسی چیزیں جن میں کوئی جبر نہیں ہوتا بلکہ حسن اور سلیقہ ہوتا ہے سید عبداللہ ان کو کلچر کے ذیل میں شمار کرتے ہیں-

ایک ہی ملک میں بہت سے کلچر پائے جاتے ہیں زبان کلچر کا ایک نہایت اہم مظہر ہے- ہر ملک میں چند کوسوں کے فاصلے پر زبان کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے- ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف النوع زبانوں کا ہونا کلچر کا تنوع ہے- ایک ہی ملک کے مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کا کلچر مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص زبان رسم و رواج اور رہن سہن ہوتا ہے لیکن اس ملک میں کچھ مشترک چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو مجموعی طور پر اس قوم کا کلچر شمار ہوتی ہیں- سید عبداللہ اس کے لئے ایک مثال دیتے ہیں ایک گھر میں رہنے والے سبھی افراد کا مزاج ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہوتا ہے جب اس گھرانے کا مجموعی مزاج دیکھا جائے گا تو سب افراد میں کچھ مشترک چیزیں پائی جائیں گی- اس گھرانے کے مخصوص مجموعی رویے کو سید عبداللہ کلچر سے تعبیر دیتے ہیں-

سید عبداللہ مذہب کو کلچر سے بھی عظیم قوت تصور کرتے ہیں ان کے خیال میں کلچر کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہوتی ہیں جبکہ مذہب کا تعلق انسان کی روح سے ہوتا ہے- کلچر کا اظہار زبان اور فنون لطیفہ میں ہوتا ہے اور کلچر کسی بھی علاقے میں ایک فطری انداز میں پایا جاتا ہے- سید عبداللہ کلچر کو زندہ تخلیقی قوت سمجھتے ہیں اور تہذیب کو کلچر کا بہروپ مانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ تہذیب کو کلچر کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن جس طرح اصل اور بہروپ میں فرق پایا جاتا ہے اسی طرح تہذیب اور کلچر میں بھی فرق موجود ہے۔[۲۸]

ہر قوم کی اپنی انفرادی تہذیبی شناخت ہوتی ہے کچھ قوموں میں بعض تہذیبی پہلو یکساں پائے جاتے ہیں لیکن کچھ مخصوص سرگرمیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو صرف ایک قوم سے منسوب ہوتی ہیں اور انہیں منفرد سرگرمیوں کی بنا پر

اس قوم کا کلچر دنیا کی تمام اقوام سے انفرادیت کا درجہ رکھتا ہے۔سبط حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء میں کلچر کے بارے میں لکھتے ہیں کلچر لاطینی زبان کا لفظ اور اور انگریزی زبان کی اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپیوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا، جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی، کھیتی باڑی کرنا کے ہیں۔

انگریزی زبان میں تو تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن اردو فارسی اور عربی میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جمیل جالبی کی طرح سبط حسن بھی تہذیب کو کو شائستگی کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں جب کسی شخص کو تہذیب یافتہ کہا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص شائستہ اطوار کا مالک ہے اس شخص کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، رہن سہن اور فنون لطیفہ کا اچھا ذوق ہے۔[۲۹] سبط حسن تہذیب کا یہ نظریہ پیش کرتے ہیں:

> کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے رہن سہن، فنون لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افسوں، اخلاق و عادات، رسوم و روایات عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔[۳۰]

سبط حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء میں تہذیب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان اور تہذیب آپس میں لازم و ملزوم ہیں ان دونوں کا ایک دوسرے کے بنا وجود نہیں ہے تہذیب ہی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان دوسری تمام تخلیقات سے ایک الگ درجہ رکھتا ہے۔انسان کے اندر بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو اس کے علاوہ دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں موجود نہیں ہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے انسان تہذیب پر قدرت رکھتا ہے۔انسان کو ہاتھ پیر عطا کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کے آلات و اوزار بناتا ہے اور اپنے ذہن اور جسم کی مدد سے بہت سی چیزیں تخلیق کرتا ہے۔ تہذیب کی دوسری اہم خصوصیت جو انسان کو عطا کی گئی ہے اس کی آنکھیں ہیں جن کی مدد سے وہ نئی نئی چیزیں ایجاد کرتا ہے۔ تیسری اہم خصوصیت انسان کی زبان ہے انسان کے اندر گویائی کی صلاحیت موجود ہے اپنی زبان سے وہ اپنے تجربات احساسات اور خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے اور زبان کا ورثہ اپنی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جو کسی معاشرے میں مل جل کر ایک گروہ کی مانند رہتا ہے اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے وہ کھیتی باڑی کرتا ہے اور تمام انسان ایک دوسرے کی مل جل کر مدد کرتے ہیں اور انسانوں کی زندگیوں کا دار و مدار ایک دوسرے پر ہوتا ہے۔انسان کو

عقل کی دولت سے نوازا گیا ہے وہ مختلف چیزوں میں اپنی عقل کی بناپر تفریق کر سکتا ہے۔

سبط حسن تہذیب کی ان خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تہذیب ایک انسانی تخلیق ہے اور انسان کے بنا تہذیب کا کوئی وجود نہیں ہے۔انسان ماں کے پیٹ سے تہذیب لے کر نہیں پیدا ہوتا بلکہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے وہ رہن سہن کے آداب، بات چیت کرنا اور اپنے تمام سماجی فرائض ادا کرنا معاشرے سے ہی سیکھتا ہے۔تہذیب ایک نسل سے دوسری نسل میں جسم کے ذریعے منتقل نہیں ہوتی بلکہ تہذیب انسان اپنے معاشرے سے ہی سیکھتا ہے اور وہی تہذیب اپناتا ہے جو اس معاشرے میں رائج ہوتی ہے۔بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اپنے ماحول سے ہی زبان سیکھتا ہے اس کے گھر میں جو زبان بولی جاتی ہے بچہ بھی وہی زبان بولتا ہے وہی کھانا کھاتا ہے جو اس کے والدین اسے کھلاتے ہیں کپڑے بھی ویسے ہی پہنتا ہے جو گھر والے اسے پہناتے ہیں اس طریقے سے اس کے والدین کی تہذیب اس بچے کی تہذیب بن جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری وساری رہتا ہے۔[۳۱]

سبط حسن تہذیب کے عناصر ترکیبی کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا میں قدیم وجدید جتنی بھی تہذیبیں پائی جاتی ہیں ان تمام تہذیبوں کی تشکیل ان چار عناصر طبعی حالات، آلات واوزار، نظام فکر واحساس اور سماجی اقدار سے مل کر ہوتی ہے۔دنیا کے تمام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک چاہے مشرق ہو یا مغرب، سرد علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں یا گرم درج بالا تہذیب کے عناصر ان میں قدرے مختلف تو ہوں گے لیکن ان چاروں عناصر میں سے کوئی نہ کوئی ایک عنصر ضرور پایا جاتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ملک کی تہذیب میں کوئی عنصر زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔یہ تمام عناصر ایک دوسرے پر اثرانداز ہو رہے ہوتے ہیں۔

سبط حسن کا کہنا ہے کہ تہذیب چار عناصر طبعی حالات، آلات واوزار، نظام فکر واحساس اور سماجی اقدار سے مل کر تشکیل پاتی ہے اور تہذیب کی تشکیل میں طبعی حالات کا بڑا عمل دخل ہے ہر تہذیب کا اپنا ایک مخصوص جغرافیہ ہوتا ہے ماحول، رہن سہن، موسم، لباس پر اثرانداز ہوتا ہے ہر علاقے کی تہذیب دوسرے علاقوں سے مختلف ہوتی ہے میدانی علاقوں میں رہنے والوں کی تہذیب پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کی تہذیب سے یکسر مختلف ہوتی ہے تہذیب کے اس فرق کی وجہ طبعی حالات ہیں انسان کے جیسے طبعی حالات ہوتے ہیں اس کے مطابق ہی اس کی تہذیب بھی ہوتی ہے۔[۳۲] ڈاکٹر ساجد امجد طبعی حالات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> طبعی ماحول بڑی شدت سے انسانی ذہن پر اثرانداز ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ ایک مزاج یا طرز عمل وجود میں آجاتا ہے اور جب یہی طرز عمل باقاعدہ نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پوری قوم اس سے متاثر ہونے لگتی ہے اور جب اس طرز احساس کا اظہار ہونے لگتا ہے تو یہی مزاج یا طرز احساس قوم کی تہذیب

کہلاتا ہے۔[۳۳]

سبط حسن تہذیب کا دوسرا اہم عنصر آلات واوزار کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں جس طرح آلات واوزار میں ترقی آتی گئی تہذیب بھی اسی طرح ترقی کرتی گئی اس کی مثال سبط حسن یہ دیتے ہیں کہ پتھر کے زمانے میں جب ہڈی یا پتھر سے آلات واوزار بنائے جاتے تھے تب اس دور کی تہذیب مختلف تھی جب انسان نے ترقی کر کے کانسے اور لوہے کے اوزار بنانا شروع کیے تو اس دور کی تہذیب بھی ان آلات واوزار کے ساتھ ترقی کرتی گئی جنگلوں کے بجائے عمارات تعمیر کر کے انسان اس میں رہنے لگا کھیتی باڑی کر کے اپنے لیے غذائیں اگائیں رفتہ رفتہ ایک معاشرتی ڈھانچہ قائم ہو گیا جس میں نظم وضبط، قانون، قائدے کے مطابق ایک گروہ انسانی رہنے لگا۔

نظام فکر واحساس کو تہذیب کا تیسرا عنصر بتاتے ہوئے سبط حسن کہتے ہیں انسان ایک باشعور اور عقل رکھنے والی مخلوق ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر انسان نے اپنے ذہن سے کام لے کر ترقی حاصل کر لی باشعور افراد اپنے ذہن سے مدد لے کر ترقی کی منازل طے کر کے تہذیب یافتہ انسان کہلائے یہ اجتماعی رویہ نظام فکر واحساس کہلاتا ہے۔ تہذیب پر نہ صرف طبعی حالات بلکہ نظام فکر واحساس بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

سبط حسن کہتے ہیں ہر تہذیب کا مخصوص نظام فکر واحساس ہوتا ہے یہ نظام اس رشتے کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے جو معاشرے کے نظام اور موجودات میں استوار ہوتا ہے۔ فکر واحساس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں انسان نئے نئے تجربات کرتا رہتا ہے جس سے اس کے خیالات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اس کی مثال سبط حسن یہ دیتے ہیں کہ انسان پہلے یہ خیال کرتا تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے اور اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ زمین چاند اور سورج کے گرد گھومتی ہے اب جبکہ سائنس نے یہ بات ثابت کر دی کہ ہماری زمین سورج کے گرد گھومتی ہے تو انسان کے خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔

تہذیب کا چوتھا اہم عنصر سماجی اقدار ہیں سبط حسن کسی معاشرے کے روابط، اخلاق وعادات، طرز بود وباش، رسم ورواج کو اس معاشرے کی سماجی اقدار کا نام دیتے ہیں۔[۳۴] یہ اقدار صدیوں کی روایات سے تشکیل پاتی ہیں کوئی قانون ان کو معاشرے میں نافذ نہیں کرواتا۔ سماجی اقدار کا دار ومدار اس قوم کے مذہب کی تعلیمات کے مطابق ہوتا ہے۔ مذہب کے فرق کی وجہ سے مشرق اور مغرب کی سماجی اقدار میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسا معاشرہ جہاں پر مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہوں وہاں صرف حلال گوشت کھایا جائے گا جب کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے حلال وحرام کی تمیز کیے بغیر ہر طرح کا گوشت کھائیں گے۔ کسی بھی معاشرے

کی سماجی اقدار اسے دوسرے معاشروں سے انفرادیت بخشتی ہیں جس طرح ہر معاشرے کی مخصوص سماجی اقدار ہوتی ہیں اسی طرح بعض تہذیبوں میں مشترک سماجی اقدار بھی پائی جاتی ہیں۔

فیض احمد فیض نے پاکستان ٹیلی ویژن میں "موضوعِ سخن" کے نام سے تقریر کا ایک سلسلہ تھا جس میں ملک کے نامور اہل فکر کو مدعو کر کے کسی موضوع پر خیالات کے اظہار کا موقع دیا جاتا تھا" پاکستانی ثقافت "کے عنوان سے فیض نے ایک تقریر میں مضمون پڑھا۔فیض کا یہ مضمون ایک ایسی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ تھا جس میں بانو قدسیہ جیسی متعدد نامور دانشوروں اور تین سو سے زائد اہل علم کی اتفاق رائے کے نتیجے میں یہ رپورٹ تیار کی گئی تھی اس مضمون میں فیض احمد فیض اس رپورٹ کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

فیض احمد فیض تہذیب و ثقافت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر موضوع ہے اس پر بہت سے بحث و مباحثے ہو چکے ہیں تہذیب کو چند لفظوں میں سمیٹنا اور اس کی کوئی حتمی تعریف پیش کرنا ایک مشکل امر ہے یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں ہر دور میں بہت زیادہ گفتگو کی جاتی رہی ہے لیکن تشنگی ابھی باقی ہے۔فیض کی رائے ہے کہ کلچر کے بارے میں ہمارا تصور یہی ہے کہ یہ تو امراء کی عیاشی کی چیز ہے عام آدمی کا کلچر سے کوئی لینا دینا نہیں۔عام آدمی کو زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی کپڑا اور مکان سے فرصت ملے، ضروریات زندگی پوری ہونے کے بعد ہی کلچر پر بات کی جائے گی۔کلچر کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر ہمارے ہاں یہ پایا جاتا ہے کہ کلچر تو طبقاتی ہوتا ہے امیر غریب شہری دیہاتی کسان سرمایہ دار تاجر جاگیر دار مزدور نوجوان ان سب کا اپنا اپنا کلچر ہے اسی طرح علاقائی کلچر ہر علاقے کا سندھی بلوچی پختون پنجابی سب کا اپنا اپنا الگ کلچر ہے۔

کلچر محض امراء کی عیاشی کی چیز ہے اس پر فیض احمد فیض اپنا نقطہ نظر یہ پیش کرتے ہیں کہ غریب آدمی جو مشکل سے اپنی ضروریات زندگی کا سامان جمع کرتا ہے اسے بھی تفریح کی ضرورت پڑتی ہے ہے وہ بھی اپنی تفریح کے لیے تھیٹر جا کر یا کبڈی کھیل کر یا کسی نہ کسی طریقے سے اپنی تفریح کا سامان جمع کرتا ہے غربت کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر ہی لیتا ہے کیونکہ جس طرح اسے اپنی جسمانی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے روٹی کی ضرورت ہے اسی طرح روح کی تسکین کے لیے بھی اسے تفریح کی ضرورت پڑتی ہے اور تفریح بھی روٹی کپڑا مکان کی طرح اس کی ضروریات زندگی میں شامل ہے۔

کلچر کے بارے میں ہمارے ہاں جو دوسرا نقطہ نظر پایا جاتا ہے کہ کہ ہر طبقے کا اپنا ایک کلچر ہوتا ہے فیض احمد فیض کہتے ہیں کہ ہر قوم کے اندر امراء شرفا غرباء ان تمام طبقات کا اپنا اپنا کلچر ہوتا ہے تمام طبقات کا کلچر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے امیروں کا ان کی حیثیت کے مطابق کھانا پینا رہن سہن ہو گا اور غریب طبقے کا ان کی حیثیت کے

مطابق-ہر طبقے کا اپنا اپنا الگ کلچر ہونے کے باوجود ان میں کچھ ایسے مشترک عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو اجتماعی ہوتے ہیں وہ مشترک عناصر کلچر کے ذیل میں آتے ہیں- اسی طرح ہر علاقے کی اپنی ایک مخصوص ثقافت ہوتی ہے ان علاقوں کی ثقافت میں جو مشترک عناصر ہوتے ہیں ان کو یکجا کیا جائے تو وہ مجموعی طور پر اس قوم کا کلچر شمار ہو گی-

ایک روسی کتاب اسلامی تہذیب و تاریخ میں اسلامی تہذیب کے عوامل میں پانچ عقائد جو ہمارے ایمان کا لازمی حصہ ہیں جس میں اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، تمام آسمانی کتب پر ایمان، انبیاء علیہ السلام پر ایمان اور آخرت پر ایمان شامل ہے-ان پانچ عقائد کو اس کتاب میں اسلامی تہذیب کے عوامل قرار دیا گیا ہے اور اسلامی تہذیب کے عناصر میں اسلام کے پانچ اہم رکن کلمہ طیبہ، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج کو شامل کیا گیا ہے- کتاب اسلامی تاریخ و تہذیب کے مصنف نے اسلامی تہذیب میں محض ان عقائد اور رکن کو شامل کیا ہے اور کسی بھی دنیاوی چیز مثلاً لباس، کھانے پینے، رہن سہن، رسم و رواج کو اسلامی تہذیب میں جگہ نہیں دی-

فیض احمد فیض کا بھی اسلامی کلچر کے بارے میں یہی نظریہ ہے کہ دراصل اسلامی کلچر یہی ہے کیونکہ یہی ہمارے عقائد اور رکن ایسے مشترک عناصر ہیں جو ہر اسلامی ملک میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ لباس، رہن سہن، زبان اور رسم و رواج پر عقیدے کا اثر تو ضرور ہوتا ہے لیکن ہر اسلامی ملک میں میں یہ الگ الگ طریقے سے موجود ہوتے ہیں۔[۳۵] درحقیقت اسلامی کلچر یہ پانچ عقائد اور رکن ہی ہیں- جس طرح تہذیب کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف آرا ملتی ہیں اسی طرح اسلامی تہذیب کے بارے میں بھی ہر شخص کا اپنا ایک مختلف نقطہ نظر ہے بعض حضرات مذہب کو تہذیب کا کل سمجھتے ہیں لیکن بعض اہل علم مذہب کو محض تہذیب کا جزو قرار دیتے ہیں- سبط حسن کا اسلامی تہذیب کے بارے میں کہنا ہے اگر اسلامی تہذیب سے مراد اسلامی عقائد اور رسوم ہیں تو کیا دنیا بھر کے تمام اسلامی ممالک کی تہذیب ایک جیسی ہے؟ عرب ممالک اور انڈونیشیا کی تہذیب مذہب کی بنیاد پر ایک نہیں ہے بلکہ دونوں ممالک کی تہذیبوں میں مشترک اسلامی عناصر پائے جانے کے باوجود بھی اختلاف پایا جاتا ہے دنیا بھر کے مسلمانوں کی تہذیبیں ایک جیسی نہیں ہیں اسی طرح ایران مراکش افغانستان اور سوڈان کی تہذیبیں بھی ایک جیسی نہیں ہیں۔[۳۶] اس کی وجہ سبط حسن یہ بتاتے ہیں کہ مذہب تہذیب کا جزو تو ضرور ہے لیکن تہذیب کی بنیاد مذہب پر استوار نہیں ہے اور نہ ہی مذہب کے حوالے سے کسی بھی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہا جاسکتا ہے اگر مذہب ہی تہذیب کا کل ہوتا تو دنیا بھر کے تمام اسلامی ممالک کی تہذیبوں میں رتی برابر بھی فرق نہیں ہوتا- سبط حسن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مذہب کو تہذیب کا جزو قرار دیتے ہیں کل نہیں-

سید عبداللہ اسلامی کلچر سے مراد مسلم کلچر لیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ مسلم کلچر اسلامی عقائد پر منحصر ہوتا ہے اس لیے اسلامی کلچر سے مراد مسلمانوں کا کلچر ہی ہے تاہم اسلامی کلچر میں بعض ایسی بھی چیزیں دوسری اقوام کے ساتھ رہتے ہوئے جذب ہو گئی ہیں جن کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں بہر حال اسلامی عقائد ہی اسلامی کلچر پر غالب رہے ہیں کچھ ضعیف الاعتقاد مسلمانوں نے اسلامی کلچر میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل کر لیں ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ اسلامی کلچر کی بنیاد قرآن مجید اور نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات پر رکھی گئی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بعض ایسے عناصر بھی شامل ہو گئے جن کا مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔اسلام سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے رہن سہن، کھانے پینے، لباس غرض زندگی گزارنے کے تمام آداب ہمیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز زندگی سے معلوم ہوتے ہیں۔لباس کلچر کا نہایت اہم جز ہے اسلام میں ایسا لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مشابہت رکھتا ہو لباس ایسا ہو جو پاک صاف ہو اور جس میں نماز ادا کی جا سکے اسی طرح کھانے پینے کے متعلق بھی یہی ارشادات ہیں کھانا حلال ہو حرام چیزوں کے استعمال کی ممانعت ہے رہن سہن میں بھی عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ حکم ہے مرد کو نگاہیں نیچی رکھنے کا جب کہ عورت کو پردے میں رہنے کا حکم ہے علاوہ ازیں سلام دعا، نشست و برخاست والدین اور بزرگوں کا احترام زندگی کے دوسرے معمولات جن میں خرید و فروخت تجارت وغیرہ شامل ہیں زندگی کے ہر پہلو میں نبی پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور قرآن مجید کے احکامات ماننے کا حکم ہے۔[۳۷]

کسی بھی مذہب کے کائنات کے بارے میں خالق اور مخلوق کے بارے میں اور زندگی اور موت کے بارے میں جو بنیادی تصورات اور عقائد ہوتے ہیں انہیں پر اس مذہب کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کی تشکیل ہوتی ہے۔ہندو مذہب میں کائنات کے بارے میں جو نظریہ پایا جاتا ہے اس نظریے کے مطابق کائنات کی تخلیق کسی بھینٹ کا نتیجہ ہے کائنات کو تخلیق کرنے والا خود بھینٹ چڑھ گیا اور اس کے اعضائے جسمانی کی تقسیم کے ساتھ ہی ذات پات کی تقسیم عمل میں آئی جیسے کہ برہمن برہما کے منہ سے پیدا ہوئے کھشتری اس کے بازوؤں سے ویش اس کے رانوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے۔[۳۸] اسی وجہ سے ہندو مذہب میں شودروں کو کم تر ذات سمجھا جاتا ہے۔

ہندو مذہب میں کائنات کے بارے میں بہت سے نظریات پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ کائنات کی ہر چیز خالق بھی ہے اور مخلوق بھی اسی نظریے کے بنا پر ہندو حیوانوں درختوں آگ پانی ہر چیز کی پوجا

کرتے ہیں ہندو مذہب میں کثرت پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے-عبادات میں بھی متضاد عقیدے پائے جاتے ہیں کہیں دیوتاؤں کی تعداد کم اور کہیں زیادہ بتائی گئی ہے وید ہندوؤں کی مقدس الہامی کتاب ہے جو سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی لیکن اب اس کا ترجمہ ہندوستان کی مقامی بولیوں میں بھی ہو چکا ہے- رگ ویـــد میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳۴۰ بتائی گئی ہے۔[۳۹] ہندوؤں کے مطابق کچھ دیوتا زمین پر کچھ آسمانوں میں کچھ فضا میں رہتے ہیں۔[۴۰] بعض دیوتا جانوروں میں بھی اور درختوں میں بھی رہائش پذیر ہیں۔[۴۱]

عقیدہ تثلیث ہندوؤں کے ایمان کا حصہ ہے جس میں برہما وشنو اور شیو کی پوجا کی جاتی ہے ان کے ہاں ایک اور تصور رسالت کے لحاظ سے بھی پایا جاتا ہے جس میں رشی کو وہ رسول انبیاء کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں- ہندوؤں کے ہاں بار بار جنم لینے کا عقیدہ پایا جاتا ہے ہندومت میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ انسان اگر کسی دکھ درد یا بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کے پچھلے جنم کے گناہوں کا نتیجہ ہے-ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی ذاتی پسند ہو ناپسند کی بنا پر مذہب میں کمی و بیشی کرتے رہتے ہیں-

ہندوؤں کا زیادہ تر رجحان لوک کہانیوں کی طرف ہے-ہندو دیومالائی قصے کہانیوں پر بہت پختہ عقیدہ رکھتے ہیں ہندوؤں کے دیوی اور دیوتا سب فانی ہیں وہ اپنی لمبی لمبی عمریں گزارنے کے بعد مر جاتے ہیں-ہندوؤں کے ہاں ایک عقیدہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ عالم بالا کی ایک بستی میں دیوتاؤں کی بیویاں رہتی ہیں شادی بیاہ میں شرکت کرنے والے لوگ اس بات پر خوشیاں مناتے ہیں کہ ہمارے دیوی دیوتاؤں نے بھی شادیاں کیں تھیں-

ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف دیوتاوں کی پوجا کرتے ہیں اگر وہ اس دیوتا کے علاوہ کسی دوسرے دیوتا کی پرستش کریں تو وہ اس بات کو شرک کے زمرے میں نہیں لاتے بلکہ ان کے پجاریوں کا کہنا ہے کہ ان کے دیوتاؤں کے آپس میں دوستانہ تعلقات تھے-ہندو اپنے مذہب کے علاوہ ہر مذہب کو راسخ سمجھتے ہیں اور اپنے ملک کے علاوہ کسی بھی دوسرے ملک کو پسند نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم میں وہ کسی دوسرے ملک میں سفر نہیں کرتے تھے—

ہندو خود گوشت نہیں کھاتے اور اور دوسری گوشت کھانے والی اقوام کو ظالم سمجھتے ہیں ان کے ہاں صرف اچھوت کمتر لوگوں کو گوشت کھانے کی اجازت ہے ان کے نزدیک گوشت کھانے سے انسان خود بھی ناپاک ہو جاتا ہے لہذا تمام اقوام جو گوشت کھاتی ہیں ہندوؤں کے نزدیک ناپاک ہیں ہندوؤں کا کسی جانور کا گوشت نہ کھانے کے پس پردہ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کا جنم بار بار ہوتا ہے تو کبھی حیوان کی صورت میں بھی ہوتا ہے اگر وہ کسی

جانور کا گوشت کھائیں گے تو ہو سکتا ہے اس میں ان کے کسی عزیز کی روح موجود ہو اس لیے وہ گوشت کھانے سے اجتناب کرتے ہیں گوشت نہ کھانے کے پیچھے ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ان کے نزدیک ان کے دیوتا حیوانوں اور درختوں میں بھی موجود ہوتے ہیں اس لیے وہ کسی جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ہندو مذہب میں گائے کو بہت مقدس سمجھا جاتا ہے گائے کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے ہندو گائے کے گوبر اور پیشاب کو بھی شفا سمجھتے ہیں۔[۴۲]

کلچر کے بارے میں میں اردو ادیبوں کے مختلف نظریات ملتے ہیں۔جمیل جالبی مذہب کو کلچر میں شامل کرتے جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ مذہب کو کلچر کا سرچشمہ مانتے ہیں۔جمیل جالبی کے ہاں کلچر ایک باضابطہ عمل ہے جسے معاشرے کے تمام افراد آزادانہ طور پر ادا کرتے ہیں۔جمیل جالبی اپنی کتاب پاکستانی کلچر میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وقت کے ساتھ کلچر بدل جاتا ہے انسان کو نئے حالات میں بدل جانا چاہیے جبکہ سید عبداللہ قدرتی تبدیلی کے قائل نظر آتے ہیں۔

کلچر کی تعریف ہر مضمون فلسفہ،ادب،نفسیات،عمرانیات،بشریات،اور تاریخ کی کتابوں میں مختلف بیان کی گئی ہے ان تمام حوالوں سے کلچر کی تعریف بیان کرنا ممکن نہیں لیکن اردو ادب اور انگریزی میں کلچر جن معنوں میں استعمال ہوا ہے اس پر مختصر اتبصرہ پیش کیا جا چکا ہے۔پہلے پہل تہذیب کے لفظ کو شائستگی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا آداب مجلس کی پابندی ہی کو ایران اور ہندوستان کے امرا تہذیب سمجھتے تھے۔

تہذیب، ثقافت، تمدن ان تینوں الفاظ کو ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یہ تمام الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی ہیں۔ تہذیب و ثقافت میں بہت سی قدریں مشترک بھی پائی جاتی ہیں لہذا تہذیب و ثقافت کو ایک دوسرے سے الگ قرار نہیں دیا جا سکتا۔کسی بھی دور اور کسی بھی زبان میں تہذیب و ثقافت کے لئے کوئی مخصوص تعریف متعین نہیں ہو سکی مختلف ناقدین اور اہل علم نے اپنے اپنے مختلف نظریات تہذیب و ثقافت کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔اس لفظ کی کوئی کوئی مخصوص تعریف متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس کو سمجھنے میں بہت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔مختلف مکتبہ فکر کے حامل افراد کے ہاں اس لفظ کی تعریف اور مفہوم بیان کرنے میں اختلافات پائے گئے ہیں۔

مغربی مفکرین کے ہاں اور مشرق کے نقادوں نے بھی اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کلچر کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اہل مغرب میں الفریڈ کروبر فرانز بوس میتھیو آرنلڈ اور ایڈورڈ ٹائلر نے کلچر کے بارے میں اپنے اپنے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ایڈورڈ ٹائلر نے پہلی دفعہ کلچر کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا۔اسی طرح اردو مصنفین میں سرسید احمد خان وہ پہلے دانشور تھے جن کے ہاں تہذیب کا جدید مفہوم ملتا ہے۔ جمیل جالبی، سید

عبداللہ، سبط حسن اور فیض احمد فیض کے ہاں کلچر کے بارے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ مشرق میں ثقافت کو کلچر کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تہذیب کو کلچر کے معنوں میں لیکن تہذیب و ثقافت کے مفہوم میں اختلافات پائے جاتے ہیں ان دونوں الفاظ کے بارے میں اتفاق رائے نہیں ملتا۔ مغرب کے مفکرین کے ہاں کلچر کو ثقافت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو کلچر ہی ثقافت کے قریب تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

ابتدا میں انسان غاروں میں رہتا تھا اس کے پاس تن ڈھانپنے کے لئے کپڑے نہیں تھے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپا کرتا تھا رفتہ رفتہ انسان نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے رہنے کے لیے مکان بنائے عمارتیں تعمیر کیں اپنے لئے کپڑے بنائے جب ایک معاشرہ وجود میں آیا تو اس معاشرے میں رہنے والوں کے لیے معاشرتی اقدار بھی متعین ہوئیں یوں ایک مخصوص جغرافیائی میں رہنے والوں کے لیے ایک تہذیب وجود میں آئی۔

ہر خطے کے باسیوں کا اپنا ایک انفرادی کلچر ہوتا ہے جو دوسرے ملکوں کے رہائشیوں سے مختلف ہوتا ہے ہر کلچر کی اپنی انفرادی شناخت ہوتی ہے لیکن دنیا کی تمام تہذیبوں میں کچھ مشترک عناصر بھی ملتے ہیں خطے کے لحاظ سے موسم اور ماحول کی نسبت سے کلچر میں تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ ہر خطے کے باسیوں کا اپنا ایک مخصوص طرز بود و باش ہوتا ہے اس جگہ کے رہائشیوں کا رہن سہن، لباس، زبان جغرافیہ کے مطابق ہوتی ہے۔ مذہب کلچر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے کسی بھی معاشرے میں جو عقائد پائے جاتے ہیں مذہب اس پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے کسی بھی معاشرے کے افراد رہن سہن لباس کھانا پینا عبادات رسم و رواج اپنے مذہبی عقائد کے مطابق کرتے ہیں اس لئے کلچر میں مذہب کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔

کلچر خالصتاً ایک معاشرتی عمل ہے معاشرے اور انسان کے بغیر کلچر وجود میں نہیں آسکتا ایک معاشرے کے اندر رہتے ہوئے انسان ایک ضابطہ حیات کے تحت زندگی بسر کرتا ہے یہ طرز زندگی جس میں باضابطگی پائی جاتی ہے یہی کلچر ہے کلچر مادی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مادی بھی کلچر ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتا ہے اور ایک معاشرے میں رہتے ہوئے اس کا اکتساب بھی کیا جاتا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کلچر کا تعلق وراثت سے ہوتا ہے کیونکہ ایک بچہ اپنے والدین کے کلچر کے بجائے ماحول سے بھی کلچر کا اکتساب کرتا ہے۔

کلچر دراصل زندگی گزارنے کا وہ شائستہ طریقہ ہے جس کے اندر مادی اور غیر مادی عناصر کسی معاشرے میں بغیر کسی جبر کے باضابطگی کے ساتھ پائے جائیں کسی معاشرے کے افراد میں کوئی بھی عمل اگر انفرادی ہو چاہے وہ کتنی ہی باقاعدگی کے ساتھ انجام دیا جائے وہ کلچر کے ذیل میں نہیں آئے گا ۔ کلچر دراصل وہ نظام حیات ہے جو ایک

معاشرے کے لوگوں میں مشترکہ طور پر کسی قانونی جبر کے بغیر پایا جائے معاشرے کے افراد کو کسی قاعدے قانون کے تحت رسم و رواج اور عقائد و روایات کو اپنانے پر مجبور نہ کیا جائے بہر حال انہی عقائد رسم و رواج قوانین اقدار اور روایات سے کلچر کی تشکیل ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مؤلف مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول (اتات)، ص ۹۱۴۔

۲۔ وارث سرہندی، قاموس مترادفات، ص ۴۲۷۔

۳۔ لسان الحرب الجلالتاسح بیروت دار صادر، ص ۱۹۔

۴۔ مصباح اللغات، (کراچی: سعید کمپنی، ۱۹۸۸ء)، ص ۹۶۔

۵۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء)، ص ۴۸۔

۶۔ فیض احمد فیض، "پاکستانی ثقافت" مشمولہ معیار بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد جلد دوم، شمارہ (جنوری۔جون ۲۰۱۰ء)، ص ۳۰۲۔

۷۔ وزیر آغا، معنی اور تناظر، مشمولہ کلچر کا مسئلہ، (کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلیکیشنز، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۸۱۔

۸۔ پاکستانی ثقافت کی شناخت، مشمولہ دریافت نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، شمارہ نمبر ۵، ص ۱۱۷۔

۹۔ وزیر آغا، کلچر کے خدوخال (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء)، ص ۷۰۔

۱۰۔ سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۱۴۔

۱۱۔ رابسن جیمز ہاروے (Robinson James Harvey)، *Civilization and Culture Encyclopedia Britanica INC* (امریکہ: ولیم بنٹن پبلشرز، ۱۹۷۳ء)، ص ۸۲۴۔

۱۲۔ رائے منڈ ولیم (Raymond Williams)، *A Vocabulary of keywords Culture and Society* (نیویارک: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۸۳ء)، ص ۸۷۔

۱۳۔ Ibid۔

۱۴۔ فلپ بیگ بے (Philip Bagby)، *Culture and History* (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا پریس بارکلے اینڈ کیلیفورنیا، ۱۹۵۹ء)، ص ۷۳۔

۱۵۔ Ibid۔

۱۶۔ الفریڈ ایل۔ کروئیبر(Alfred L. Kroeber)، Clyde Kluckhohn, *Culture*: (The *A Critical study of Concepts and Definitions*، Peabody Museum, Cambridge, Mass، ۱۹۵۴ء)، ص ۱۳۔

۱۷۔ Kevin Avruch, *Culture and Conflict Resolution*, (United States Institution of Peace, Washington, DC, 4th edition، ۲۰۰۴ء)، ص ۶۔۷۔

۱۸۔ ایڈورڈ بی۔ ٹیلر(Edward B.Tylor)، *Primitive Culture*, 1 vol., John Murray, (لندن: جان مری، ۶ ایڈیشن، ۱۹۲۰ء)، ص ۱۔

۱۹۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ(T.S. Eliot)، *Notes Towards the Defition of Culture*(لندن: فیبر اینڈ فیبر، ۱۹۶۱ء)، ص ۲۰۔

۲۰۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء(کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۴، ۱۳۔

۲۱۔ حامد حسن قادری، دبستان تاریخ اردو (کراچی: ۱۹۶۶ء)، ص ۳۴۴۔

۲۲۔ مقالات سر سید جلد ۶ (لاہور: ۱۹۶۳ء)، ص ۳۔

۲۳۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، ص ۴۸، ۴۷۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۲، ۵۱، ۵۰۔

۲۶۔ سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ، ص ۶۹۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۵، ۱۲۴، ۱۲۳۔

۲۹۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص ۱۴، ۱۳۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۵، ۲۴، ۱۹۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶، ۲۵۔

۳۳۔ ساجد امجد، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص۲۱۔

۳۴۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص۴۷۔

۳۵۔ فیض احمد فیض، پاکستانی ثقافت مشمولہ معیار جلد ۲ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، شمارہ (جنوری۔جون ۲۰۱۰ء)، ص۲۹۴، ۲۹۲، ۲۹۱۔

۳۶۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، ص۳۰۱۔

۳۷۔ سید عبداللہ، کلچر کا مسئلہ (لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء)، ص۴۶، ۴۱ ۴۷۔

۳۸۔ تاراچند، تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ص۹۹۔

۳۹۔ رگ وید، منڈل ۳، سوکت ۹، منتر ۹۔

۴۰۔ رگ وید، منڈل ۱، سوکت ۱۳۹، منتر ۱۱۔

۴۱۔ اتھروید، منڈل ۱، سوکت ۳، منتر ۳۔

۴۲۔ ڈاکٹر داؤد رہبر، کلچر کے روحانی عناصر (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، (۲۰۰۱ء) ص۲۴۔

باب دوم:

کرداروں کے رویوں میں تہذیبی و ثقافتی اظہار

باب دوم:

کرداروں کے رویوں میں تہذیبی و ثقافتی اظہار

کسی بھی ناول میں کرداروں کی ضرورت واہمیت ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے ہم کسی طور انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ جس طرح کوئی کہانی پلاٹ کے بغیر اپنا وجود نہیں رکھتی اس طرح ناول بھی کرداروں کے بغیر تشکیل نہیں پا سکتا۔ کرداروں کی مدد سے ہی کہانی ارتقاء کی منازل طے کرتی بالآخر اختتام پذیر ہوتی ہے اور قاری کی دلچسپی کرداروں کی وجہ سے ناول میں رہتی ہے۔ بہترین کردار نگاری کے لیے ناول نگار میں فنکارانہ صلاحیتوں اور مکالمے کرداروں کے ماحول و مزاج کے مطابق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ناول نگار گہرا سماجی شعور بھی رکھتا ہو اور ایسے کردار تخلیق کرے جس میں انسانوں کی حقیقی زندگی کا عکس نظر آسکے اور روزمرہ کی زندگی کی ترجمانی ہو۔

جو کردار ہمیں روزمرہ زندگی میں اپنے ارد گرد کے ماحول میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں وہ قاری کے حافظے پہ نقش ہو جاتے ہیں۔ ناول کی کامیابی کا بڑی حد تک دارومدار اس کی پائیدار کردار نگاری پر ہوتا ہے۔ کامیاب کردار نگاری کے لیے کرداروں کی تشکیل کے وقت تخلیق کار کو کرداروں کے سماجی مرتبے، نفسیات اور طبقے کو ملحوظ خاطر رکھ کر ہی کرداروں کو تخلیق کرنا چاہیے نیز اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ کردار تخیلاتی نہ ہوں بلکہ زندگی کے حقیقی رنگ میں رنگے اپنے ماحول کے آئینہ دار ہوں جس میں قاری اپنا عکس تلاش کر سکے اور وہی کردار کامیاب گردانے جاتے ہیں جو حقیقی زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں۔

کامیاب ناول نگار وہی ہوتا ہے جو کرداروں کو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق تخلیق کرتا ہے۔ ان کا لباس، زبان رہن سہن ان کے سماجی مرتبہ کی عکاسی کرتا نظر آنا چاہیئے۔ اگر کوئی نوکرانی بیگماتی الفاظ اور لب ولہجہ اپناتی ہے تو وہ کردار نگاری کی ایک بڑی خامی سمجھی جائے گی اور یہ کردار حقیقت سے قریب نہیں ہوگا۔ حقیقی زندگی کے ترجمان کرداروں کے ساتھ قاری ان کے دکھ میں دکھی اور خوشی میں خوش ہوتا ہے کیونکہ وہ ان کرداروں کو اپنے جیسا جیتا جاگتا انسان ہی تصور کرنے لگتا ہے اور کرداروں سے قاری کی انسیت اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ کردار نگاری کے وقت ناول نگار کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کوئی مافوق الفطرت یا ایسے کردار تخلیق نہ کرے جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہ ہو۔ ناول نگار کو چاہیے کہ وہ نہ تو تمام کردار مثالی تخلیق کرے اور نہ ہی وہ برائیوں کا مجموعہ ہوں بلکہ کردار انسانی فطرت کے عین مطابق ہونے چاہیں —

اگر تمام کردار مثالی ہوں گے تو یکسانیت سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو جائے گا اور اگر برائیوں کا مجموعہ ہوں گے تو قاری ان سے نفرت کرنے لگے گا اس لیے کرداروں کی تخلیق میں توازن قائم رکھنا چاہیے۔معاشرے میں نیک بد ہر طرح کی فطرت کے انسان ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ کی کردار نگاری کی خاصیت ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق کردارں کو تخلیق کرتی ہیں اور ان کے کردار اپنے معاشرے کی حقیقی زندگی کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ کے ہاں کامیاب کردار نگاری کے تجربے ملتے ہیں کیونکہ وہ ان تمام خصوصیات کو مد نظر رکھ کر کرداروں کو تشکیل کرتی ہیں جو کامیاب کردار نگاری کی بنیاد ہیں۔مصنفہ کے تخلیق کردہ کردار نہ فرشتوں کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور نہ ہی شیطان کا روپ اختیار کرتے نظر آتے ہیں بلکہ کردار انسانی خصوصیت کے حامل ہیں۔

بانو قدسیہ زندگی کی حقیقتوں کا وسیع مشاہدہ وادراک رکھتی تھیں۔وہ گہرے سماجی شعور اور نفسیاتی مطالعے کے بعد ہی کرداروں کو تخلیق کرتی ہیں اور ان کے کرداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تخیلاتی نہیں بلکہ معاشرے سے ہی لے گئے ہوتے ہیں جو اس معاشرے کی حقیقی معنوں میں عکاسی کرتے ہیں۔مصنفہ نے ہر طبقے، مذہب اور شعبے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو تخلیق کیا ہے جو باخوبی اپنا کردار ناول میں ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فرزانہ سید بانو قدسیہ کی اس خصوصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> بانو قدسیہ انسانوں کی اپنی کہانیاں لکھنے میں نہایت مشاق ہیں۔وہ زمین پر بسنے والے امیر، غریب،، سخی، شوم، مالک، نوکر، نوکرانی، مالکہ، بھنگن، افسر، گاہک، ملازم غرض سب لوگوں کی کہانیاں لکھتی ہیں۔[1]

زیر بحث ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار نظر آتے ہیں۔ چوکیدار، مالی، نائی، نوکرانی، مالکن، پولیس، سپاہی، جنرل، کرنل، پروفیسر، ڈاکٹر، ایڈوکیٹ مصنفہ نے اپر طبقے سے تعلق رکھنے والے نوابین سیاستدان بیوروکریٹ طبقے جاگیر دار طبقے کے کرداروں کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے کردار ہندو مذہب عیسائی مذہب بدھ مذہب سکھ مذہب اور مسلم کردار تخلیق کیے ہیں۔بانو قدسیہ نے کچھ کردار مثالی بھی تخلیق کیے ہیں اور کچھ کرداروں میں ایسی برائیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جن سے وہ کردار نفرت کا نشانہ بنتے ہیں لیکن حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ ناول کے تمام کردار اپنے کلچر سے منتخب کیے ہیں جو کہ بہترین طور پر اپنی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مصنفہ نے ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنی زبان، طور اطوار، لباس نظریات سے اپنے طبقے اور کلاس کی بہترین ترجمانی کرتے دکھایا ہے۔

بانو قدسیہ کے تمام کردار متنوع ہیں اور بعض کردار مصنفہ نے برصغیر پاک وہند کی مشترکہ تہذیب سے لیے ہیں۔ یہ کردار برصغیر پاک وہند کے کلچر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ان کرداروں میں ہندو، سکھ، مسلم، عیسائی اور

بدھ مذہب کے کرداروں کے علاوہ اینگلو انڈین کردار اور انگریز کرداروں کو بھی بانو قدسیہ نے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ ماضی سے تعلق رکھنے والے ان کرداروں کے علاوہ زمانہ حال کے کرداروں کی بانو قدسیہ نے بڑی عمدگی سے تصویر کشی کی ہے۔جدید پاکستانی کرداروں میں محلوں میں رہنے والے اور غربت کی چکی میں پسنے والے تمام کرداروں کو ناول میں شامل کیا ہے وہ اپنے معاشرے کی تمام صورتحال کو پیش کرتے ہیں۔کردار نہ صرف ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ اپنے اپنے کلچر کی کامیابی کے ساتھ تصویر کشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

شہر میں رہنے والے کردار شہری معاشرت کے نمائندہ، پر آسائش زندگی بسر کرنے والے یہ کردار زمانہ جدید کی تمام سہولیات سے آراستہ ٹھاٹ باٹ والی زندگیاں بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دیہات کے کرداروں کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے دیہاتی زندگی کی کامیاب منظر نگاری کی ہے۔مشرقی کلچر کو واضح کرنے کے لئے مصنفہ نے دیہات کے کرداروں کو لیا ہے یہ کردار اپنی مٹی، اپنی تہذیب واقدار سے پیار کرنے والے گاؤں کے کھیتوں میں کام کرنے والے اور اپنے جانوروں سے پیار کرنے والے والے ہیں۔

برصغیر کی قدیم اقدار آج صرف دیہاتوں میں ہی زندہ ہیں۔دیہاتی کرداروں کے ذریعے سے ہی یہ قدیم اقدار و روایات منظر عام پر آتی ہیں۔لحاظ، مروت، مہمان نوازی اور ادب واحترام جیسی روایات اب صرف دیہاتوں میں ہی زندہ ہیں۔شہروں میں مادہ پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ یہ روایات اپنی اہمیت کھو چکی ہیں۔بانو قدسیہ نفسیات کی طالبعلم تھیں، کردار نگاری کے وقت کرداروں کی نفسیات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔مرد اور عورت کی نفسیات کو بھی بانو قدسیہ نے باریک بینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔یہ بانو قدسیہ کی نفسیاتی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

بانو قدسیہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں رہیں، اس تہذیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس تہذیب میں بسنے والے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو ناول کا حصہ بنایا۔ناول کے تمام کردار اپنے مذہب اور کلچر سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ساتھ ہی ساتھ برصغیر کی تہذیب و ثقافت سے بھی بھرپور واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کرداروں کی مدد سے نہ صرف برصغیر کی تہذیب و ثقافت سے آگاہی ملتی ہے بلکہ تاریخی واقعات کا بیان بھی ملتا ہے۔بانو قدسیہ کا کرداروں کا بیان کرنے کا انداز ایسا ہے کہ وہ ان کو کسی نہ کسی تاریخی واقعے کے ساتھ جوڑ دیتی ہیں۔ہر کردار اپنے مذہب کے کسی مذہبی یا تاریخی کردار سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔بانو قدسیہ کے اس انداز کی وجہ سے ان تاریخی شخصیات سے بھی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔کرداروں کے ہاں تاریخی واقعات کا بھی ذکر ملتا ہے۔برصغیر پاک وہند کے کرداروں کے ہاں قیام پاکستان سے پہلے جو کشمکش تھی اس کا بیان بھی کرداروں کی زبانی ملتا ہے۔پاکستان بننے کے بعد پاکستانی تاریخ کے اہم سیاسی موڑ کا ذکر بھی ملتا ہے۔الیکشن سیاستدانوں کے بیانوں سے پاکستان کے موجودہ حالات کا بھی پتہ چلتا ہے نیز

ہندوستان کے علاقوں کی تاریخ، معاشرتی حالات، اس دور کے لوگوں کے نظریات اور اعتقادات کا ذکر بھی ناول میں جابجا کرداروں کی زبانی ملتا ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول میں جاگیر دار طبقے کے کرداروں کو تخلیق کر کے جاگیر دارانہ نظام کی پر آسائش زندگیوں کو واضح کیا ہے۔ مصنفہ نے آئی جی، کمشنر، سیاستدان اور بیوروکریٹ طبقے کے کرداروں کے ذریعے سے ہمارے سیاسی و معاشرتی نظام کو منظر عام پر لایا ہے۔ بانو قدسیہ نے ایلیٹ کلاس کے کرداروں کے ذریعے سے ان کی شاہانہ انداز زندگی، ان کا رہن سہن، زبان اور کلچر کی بھرپور عکاسی کی ہے، علاوہ ازیں نچلے طبقے کے کرداروں کو بھی ان کے تہذیبی اور ثقافتی رویوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تہذیبی اقدار کبھی بھی کسی ایک طبقے میں پروان نہیں چڑھتیں بلکہ ہر طبقہ چاہے وہ اعلیٰ، متوسط یا نچلا طبقہ ہی کیوں نہ ہو اس کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ناول شہر لازوال، آباد ویرانے نہ صرف مشترکہ تہذیب و ثقافت کی زندہ داستان ہے بلکہ دور جدید کے پاکستانی معاشرے کا بھی آئینہ دار ناول ہے۔ بانو قدسیہ نے برصغیر کی تہذیب و ثقافت کو بھی اور جدید پاکستانی معاشرے کی ثقافت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ہر چیز کا گہرائی اور گیرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ اس آنکھوں دیکھے مشاہدے کے بعد ہی انھوں نے ان کرداروں میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کو پیش کیا ہے۔

زیر بحث ناول میں بیان کیے گئے تمام واقعات اور جگہیں تخیلاتی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ بانو قدسیہ کا بچپن جس پہاڑی علاقے میں گزرا۔ اس کا تفصیلی بیان ناول کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ مصنفہ لاہور میں جس کالج اور ہاسٹل میں رہائش پذیر تھیں کرداروں کے ذریعے سے ان جگہوں کا نقشہ بھی بہت باریک بینی سے کھینچا ہے۔ برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم موڑ برصغیر کی تقسیم کا واقعہ اس واقعے کی تفصیل بھی ہمیں بانو قدسیہ کرداروں کی زبانی بتاتی ہیں۔ پاکستان کے موجودہ حال کی داستان بھی کرداروں کے ذریعے سے ہی ہم تک پہنچتی ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ بانو قدسیہ نے حقیقت نگاری کے ساتھ کامیاب کردار نگاری کی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی جس مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں بانو قدسیہ نے اپنا بچپن گزارا یہ تہذیب برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ برصغیر پاک و ہند کی تہذیب، اس دور کے رسم و رواج، اقدار، اعتقادات، توہمات، نظریات، رہن سہن، کھانا پینا معاملات زندگی غرض ہر پہلو کا بیان بڑی باریک بینی کے ساتھ بانو قدسیہ نے کرداروں میں پیش کیا ہے۔ چونکہ بانو قدسیہ اسی تہذیب کی پروردہ تھیں قدیم تہذیب کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ایک نئی تہذیب جو تقسیم کے بعد پروان چڑھی اس تہذیب میں بھی بانو قدسیہ نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ گزارا۔

مصنفہ دور جدید کے پاکستانی کرداروں کے ذریعے سے اس عہد کے تہذیب و تمدن کو بھی واضح شکل میں بیان

کرتی ہیں-ناول کے کرداروں میں مختلف تہذیبی اور ثقافتی رویوں کا اظہار ملتا ہے-ان تہذیبی و ثقافتی رویوں میں لباس، رسومات، رہن سہن، ملنے جلنے کے آداب اور طریقے، عقائد، عبادات معاشرت، تہوار اور اخلاقی اقدار شامل ہیں-ہر قوم مذہب اور طبقے کے لوگوں کے تہذیبی و ثقافتی رویے دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں-ناول میں ہمیں ہر کردار اپنے طبقے اور کلاس کے مطابق نظر آتا ہے-

حکیم ابراہیم مغل ناول کا مرکزی کردار ہے جو مسلم تہذیب کا نمائندہ کردار ہے اپنے لباس، نشست و برخاست، روایات اور اقدار میں مکمل طور پر اپنی تہذیب کو اپنائے ہوئے ہے-یہ کردار ہمیشہ سفید شلوار قمیض زیب تن کرتا ہے اور اس کے چہرے پر محراب، لمبی سفید داڑھی سنت کے عین مطابق، سر پر سفید پگڑی، ہاتھوں میں تسبیح، یہ کردار اپنے حلیے سے بھی اور طور اطوار سے اپنی مسلم تہذیب کی عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے-لباس محض تن پوشی ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی قوم کی ثقافت اور تشخص کی علامت ہوتا ہے-کسی بھی شخص کا لباس دیکھتے ہی اس کے مذہب اور تہذیب و ثقافت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے-جیسا کہ ناول کے کردار ابراہیم مغل کے لباس کو ہی دیکھ کر اس کی تہذیب کا پتا چل جاتا ہے کہ وہ مشرقی کلچر اور اسلامی تہذیب سے تعلق رکھنے والا کردار ہے-

لباس کا کام صرف جسم کو ڈھانپنا نہیں ہوتا بلکہ ہر لباس کی ایک پوری تاریخ ہوتی ہے-صرف وہی لوگ ہی ایک جیسا لباس زیب تن کرتے ہیں جو ایک جیسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں-انسان کا لباس اس کے مذہب، روایات اور کلچر کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے-ہر مذہب کے لوگ اپنے لباس سے ہی پہچانے جاتے ہیں-لباس کسی بھی تہذیب و ثقافت کی شناخت تصور کیا جاتا ہے-لباس بدل جائے تو شناخت بھی بدل جاتی ہے-

ابراہیم مغل ایسا مضبوط کردار ہے جو اسلامی تعلیمات کو خود بھی اپنائے ہوئے تھا اور اپنے گھر والوں کو بھی نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق زندگی بسر کریں-یہ کردار ہر چیز پر اپنی تہذیب کو فوقیت دیتا ہے-ابراہیم مغل اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے-اس کردار میں اسلامی تعلیمات کا پرچار نظر آتا ہے-اسلام میں سادگی اور میانہ روی کا حکم دیا گیا ہے اور فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے-ابراہیم مغل خود بھی ان تعلیمات پر عمل کرتا اور اپنے خاندان کو بھی یہ نصیحتیں بارہا کرتا دکھائی دیتا ہے-

ابراہیم مغل کا خاندان ایک ہندو اکثریت والے علاقے میں منتقل ہو جاتا ہے-ابراہیم مغل کو یہ اپنی تہذیب اور مذہب کے لیے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندو آبادی میں رہ کر کر مذہبی امور صحیح طریقے سے ادا نہ ہو پائیں گے عید گاہ نہ ہونے کی بنا پر عید پڑھنے کہاں جائیں گے اور نئی نسل کے ذہنوں پر ہندو اکثریت والے علاقے میں رہنے کی وجہ سے ہندی تہذیب کے اثرات مرتب ہوں گے-

ابراہیم مغل مسلمانوں کے ساتھ مسلم آبادی میں رہتے ہوئے اپنی تہذیب پر کاربند رہنا پسند کرتے تھے۔ مسلم آبادی میں اپنی اسلامی تہذیب کے مطابق رسم ورواج، روایات اقدار کو اپنا کر کر انسان اپنے مذہب اور تہذیب کے قریب تر ہوتا ہے۔اور ہندو آبادی میں رہ کر یا کسی بھی دوسری تہذیب میں رہتے ہوئے اپنی تہذیب تباہ و برباد ہو جاتی ہے اس تباہ و بربادی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان مسلم سوسائٹی میں رہ کر کر اپنے دین اور تہذیب پر عمل پیرا رہے اپنی اسلامی روایات اور مذہب سے دوری اختیار کر کے اپنی تہذیب کو فراموش کر کے انسان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔

مشرقی کلچر کا نمائندہ کردار ہر بار گھر سے باہر جانے پر بہو سے گھر کے سامان کے بارے میں استفار کرتا ہے بہو کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے کھنگار کر اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے ہمیشہ فاصلہ رکھ کر بات کرنا شائستہ طور اطوار کا مالک ہے۔ بے دھڑک بہو کے کمرے میں داخل نہیں ہوتا مشرق میں آج بھی سسر کا یہی کردار ہے۔ کہانی سنانا مشرقی ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے بچوں کو کو آج بھی دادیاں نانیاں نصیحت آموز کہانیاں سناتی ہیں۔گھر کے بزرگ بچوں کو کہانیاں سناتے ہوئے ان کی دینی اور اخلاق تربیت بھی کرتے ہیں اور اپنے مذہبی واقعات بھی سناتے ہیں اس طرح بچے اپنی اسلامی تاریخ کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں۔

> بڑے بڑے عربی نام ان میں معرکے کی لڑائیاں، نصیحت آموز نتائج, عظیم الشان کارنامے اور ایسی ایسی محیر القول باتیں کہ راحیلہ اور شوکت حیران رہ جاتے ہیں اصل میں یہ کہانیاں مزے دار تھیں وہ سننا بھی چاہتے تھے لیکن دادا با کہانی سنانے کے بڑے دام لیتے۔کہانی کے گھیرے میں لا کر بڑے کام بتائے جاتے۔ نقلی دانت دھلوائے جاتے۔ تختی لکھوائی جاتی، پہاڑے یاد کرائے جاتے اور باتوں باتوں میں مونٹیسوری طریقے پر بچوں کا اخلاق اور ان کی تربیت بھی کرنا چاہتے تھے۔[۲]

انہیں دین اسلام کی تعلیمات صبر ، تحمل خود پر قابو پانا اور لالچ کو ترک کرنا سکھاتے، لالچ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کیونکہ آخر کار سب نے مر ہی جانا ہے موت کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اچانک موت آجانی ہے اس کا ایک دن مقرر ہے انسان نے سب کچھ ہیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلے جانا ہے جب ساری جمع پونجی یہیں رہ جانی ہے تو انسان کو اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہیے کیونکہ انسان خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے صرف اس کے اعمال ہی اس کے ساتھ جاتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا یہ کردار صفائی کو بہت عزیز رکھتا اپنا کمرہ اور خود کو ہمیشہ پاک صاف رکھتا ہے اور نمازوں کی پابندی کرتا ہندو اکثریت والے علاقے میں رہتے ہوئے بھی اپنے مذہبی اصولوں پر پر سختی سے کاربند ہے۔

ہندی معاشرے کے اثرات کو قبول نہیں کرتا۔ دین اسلام میں نامحرموں سے میل جول کے بارے میں احتیاط کا حکم دیا گیا ہے۔ ابراہیم مغل اسلامی تعلیمات کے مطابق مخلوط تعلیمی نظام کو بھی ناپسند کرتا اور لڑکے اور لڑکیوں کا آزادانہ میل جول بھی پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ نامحرم کی صحبت سے ہی ساری خرابی پیدا ہوتی ہے۔

ابراہیم مغل اپنے وقتوں کے نامی گرامی حکیم تھے اپنے پوتے کی بیماری کے موقع پر وہ اس کا روحانی علاج کرتے ہیں مسجد سے سے دم کروا کر پانی لاتے ان کا ماننا تھا کہ اللہ کے کلام میں شفا ہوتی ہے ان کا اعتقاد بہت مضبوط تھا ان کا ماننا تھا کہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے دعا اور علاج سے ان کے پوتے کو ضرور شفایابی نصیب ہو گی اور ساتھ ہی ساتھ جڑی بوٹیوں اور گھریلو ٹوٹکوں سے اس کا علاج کرتے، لیموں کاٹ کر اس پر نمک مرچ لگا کر اس کو توے پر پکا کر اپنے پوتے کو استعمال کرواتے۔

ابراہیم مغل خود بھی سختی سے شریعت کی پابندی کرتے اور گھر کے افراد کو بھی یہی نصیحت کرتے کہ دینی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں وہ اپنی پوتی کو بالغ ہونے پر برقع اوڑھنے کی نصیحت کرتے دین اسلام میں بھی عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ابراہیم مغل بھی اپنی پوتی کو برقع اوڑھا کر اسے اس کی مذہبی پہچان دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے لباس سے پہچانی جائے اور بری نگاہوں سے محفوظ رہے۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان جس طبع کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے آخر کار ان جیسا ہی بن جاتا ہے۔ ابراہیم مغل ہندی معاشرے میں رہتے ہوئے ہوئے بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتے ہیں ان کو ہر وقت یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ سے بچے اپنی اسلامی روایات کو بھلا کر ہندوؤں کی رسومات اپنا رہے ہیں۔ وہ بچوں پر کڑی نگاہ رکھتا ہے اور ہندوؤں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔ اپنا لباس اپنی زبان اور اپنی روایات کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے کیونکہ لباس کسی بھی قوم کی پہچان ہوتا ہے۔ جس قوم کی مشابہت اختیار کی جائے، ان جیسا لباس اور رسومات اپنائی جائیں آخر کار انسان انہی جیسا بن جاتا ہے۔

صحبت کا انسان پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے انسان جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے جیسے لوگوں سے میل ملاپ رکھتا ہے ان کی صحبت میں ان کے طور اطوار اپنا لیتا ہے اور اپنی تہذیب سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ اپنی تہذیب سے دوری سے سراسر اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے جیسے ہی لوگوں سے میل جول رکھے اور اپنی تہذیب پر کاربند رہے۔ اپنے کلچر سے بچھڑ کر انسان کو نہ دین ملتا ہے اور نہ ہی دنیا میں اپنی تہذیبی شناخت حاصل ہوتی ہے۔

ابراہیم مغل ایک ایسی ہندو اکثریت والی آبادی میں رہائش پذیر تھے جہاں کے مکین توہم پرست، من گھڑت کہانیوں اور بدشگونی پر یقین رکھتے تھے۔ اس ماحول کا رتی برابر بھی اس کردار پر اثر نظر نہیں آتا اگر کوئی ہندو ان کو نمستے

TH23134

کہہ کر بلاتا بھی تو اپنی اسلامی تہذیب کے مطابق وعلیکم سلام کہتے۔ ہر حال میں اپنے مذہب پر سختی سے کاربند رہتے۔ ابراہیم مغل کی ہر بات کے پس پردہ کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور پوشیدہ ہوتا تھا۔ علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس مسلم کردار نے اپنے مذہب سے دوری اختیار نہیں کی یہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنی اسلامی روایات اور مشرقی کلچر سے جڑا ہوا نظر آتا ہے اور اپنے خاندان کو بھی گاہے بگاہے اپنی روایات کو ترجیح دینے کی نصیحت کرتا رہتا ہے۔

شوکت سرفراز مغل کا کردار ایک ایسے بچے کا کردار ہے جس کے والدین اسے بچپن میں ایک ہندو اکثریت والے علاقے میں لاکر آباد کرتے ہیں۔ سکول میں بھی ہندو بچوں کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کے پڑوس میں بھی ہندو خاندان آباد ہوتے ہیں اس کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہندو بچوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔ہندی معاشرے میں رہنے کی وجہ سے شوکت پر ہندی تہذیب کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کی بہن راحیلہ اور اس کی سہیلیاں زیادہ تر لڑکیوں والے کھیل کھیلنا پسند کرتی ہیں۔ گڑیا گڈے کی شادی گھر گھر کھیلنا وغیرہ۔ گڈا گڈی کی شادی کے موقع پر شوکت مغل اپنے کلچر کے مطابق شادی پر ڈیزی گن سے فائر کر کے دولہا دلہن کو سلامی دیتا ہے۔ شوکت مغل پر اپنی تہذیب کے اثرات ہوتے ہیں مشرقی کلچر میں شادی بیاہ کے موقع پر فائرنگ کر کے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے یہ کردار بھی اپنی ثقافت کے مطابق شادی کے موقع پر کھیل کھیل میں اپنے کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔

اپنی جنس کے مطابق اسے لڑکوں والے کھیل کھیلنے میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی افتاد طبع کی بدولت وہ نئے نئے کھیل اپنے لئے خود ایجاد کر لیتا ہے۔ شوکت مغل کا خاندان ایک پہاڑی علاقے میں رہتا ہے۔ کبھی وہ خود کو کولمبس سمجھ کر پہاڑوں کی دوسری جانب جہاں اس کے بزرگ جانے سے منع کرتے نئی نئی جگہیں دریافت کرنے نکل جاتا اس کی فطرت ہے کہ وہ نئی نئی ایجادات کرنے کا شوقین ہے۔ کبھی بچوں کے کھیلنے والا ٹیلی فون ایجاد کرتا ٹوٹے ہوئے کیمرے سے تصویریں بنانے کی کوشش کرتا ڈیزی گن لے کر پہاڑوں پر نکل جاتا اور پرندوں کے نشانے لیتا رہتا۔ برصغیر پاک وہند میں اس دور کا مشہور کھیل "گیدڑ گیدڑ" کھیلنے کا ذکر شوکت کے کردار میں ملتا ہے۔

> گیدڑ گیدڑ کھیلنے کا آغاز ہوا۔ قرعہ شوکی کے نام نکلا اور وہ چوکی پر بیٹھ گیا۔ اب باری باری جانوروں کو حکم ہوا کہ وہ شیر کو سلام کریں۔ جوں ہی آخری لومڑی آتی اشعر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اگر لومڑی پکڑی جاتی تو شیر اپنی حکمرانی پر بحال ہو جاتا۔ اگر لومڑی دائی کو چھو پاتی تو پھر شیر کو چوکی سے اترنا پڑتا۔۔ بوہاتھ پاؤں پر چلتا آیا اور آتے ہی بولا۔
>
> چاندی کا تیرا چونترہ کوئی صندل لیپا جائے
> کانوں ترے دو مرکیاں کوئی راجہ بنسی ہوے

شیر نے بہو کو اشیر باد دی اور خوش ہو کر سر ایسے ہلایا کہ گڑھل کے پھول بھی ہلنے لگے۔بعد ازاں سریندر'روی'ایتا'شارداسب نے یہی بانی پڑھی اور اشیر باد کے مستحق ہوئے۔[۳]

شوکت مغل اپنی اسلامی تہذیب کے مطابق ٹخنوں تک اونچی شلوار اور بند کالر کی قمیض پہنتا اس کے ہندو دوست اس کے لباس کا مذاق اڑاتے تو شوکت مغل اپنے کلچر کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے ہم مغل روایت پسند ہیں اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہماری اپنی اقدار وروایات ہیں ہم اپنے کلچر کا خیال رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق لباس زیب تن کرتے ہیں۔

شوکت مغل ہندو بچوں کے ذہن میں مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے ہندو بچے اپنے مذہب کی طرف داری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محمود غزنوی نے یہاں آکر سترہ حملے کیے شوکت مغل اس بات کی یہ توجیح پیش کرتا ہے کہ محمود غزنوی ایک بادشاہ تھا اس نے دولت اور اپنے ملک میں توسیع کے لیے حملے کیے مسلمانوں نے کبھی بھی عوام کو زبردستی مسلمان نہیں کیا کیونکہ دین اسلام میں جبر نہیں ہے۔ہندو بچوں کے ذہنوں میں شروع سے ہی مسلمانوں کے خلاف یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ مسلمانوں نے برصغیر میں زبردستی حکومت کر لی جبکہ شوکت مغل اپنے مذہب کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے مغل بادشاہ اگر چاہتے تو ہندوؤں کی نیچ ذاتوں کو بڑی آسانی کے ساتھ مسلمان کر لیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

شوکت مغل ایک ایسے علاقے میں رہائش پذیر تھا جہاں کے مکین جادوٹونے پر بہت یقین رکھتے تھے بچے بھی اپنے آباؤاجداد سے یہ باتیں سن سن کر ان باتوں پر ایمان لے آئے تھے کہ جادو سے کوئی بھی چیز ممکن ہے وہ آپس میں باتیں کرتے جادو سے ریت کے ٹیلے سونے کے بن جاتے ہیں جادو سے دھوبن چڑیا آکر گڑیا کے کپڑے دھو جاتی ہے اور ربڑ کے کھلونوں کو درخت کی کھوہ میں ڈال دیا جائے تو جادو سے کھلونے میں جان آجاتی ہے۔

مشرق میں جنوں بھوتوں اور جادوٹونے پر بہت زیادہ یقین کیا جاتا ہے ناول کے تمام کردار جادوٹونے پر بہت یقین رکھتے ہیں شوکت اپنے ہم عمر بچوں کو لالچ دیتا ہے کہ ان کے کھلونوں میں جان آجائے گی ہی کہ کر وہ ان کے کھلونے ہتھیا لیتا ہے بچے بھی اس کی بات چپ چاپ مان لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بڑوں سے جادوٹونے کے بارے میں باتیں سنتے آئے تھے بھوت پریت پر اس علاقے کے لوگوں کا بہت یقین تھا۔جنوں بھوتوں کی کہانیاں بھی معاشرے میں عام تھیں شوکت کے ہاں بھی بھوتوں کی ایک ایسی کہانی کا ذکر ملتا ہے وہ اپنے ہم عمر بچوں کو روحوں کی کہانیاں سناتا ہے یہ کہانیاں وہ اپنے ارد گرد لوگوں سے سنتا رہتا ہے اور اپنے ہم عمر بچوں کو متاثر کرنے کے لئے خود سے وابستہ کرکے یہ کہانیاں سناتا ہے۔

یہ جمعرات کی شام کا ذکر ہے۔۔۔۔رات کے وقت۔۔۔۔۔ایک بڑا سا کھنڈر نما محل۔۔۔۔ مجھے اس کھنڈر کے قریب ایک لڑکی نظر آئی۔۔۔اس نے سارے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔۔۔۔ جیسے سفید جالی کے روشنی کے بنے ہوئے۔۔۔۔ جیسے کپڑے روحوں کے ہوتے ہیں۔۔۔۔اس نے آگے بڑھ کر پوچھا شوکت مغل پانی پیو گے۔۔۔ مجھ پر تو جادو ہو گیا تھا۔۔ وہ محل سے ملحق پرانے گھر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔اس میں سے سمٹا سمٹا دھواں نکل رہا تھا۔۔۔۔ وہ اندر چلی گئی اور ایک چمکتی طشتری میں جانے کیا چیز ڈھانک کر لے آئی۔۔۔ میں نے سوچا کوئی ٹونا نہ ہو۔۔۔۔ لڑکی نے سوئے ہوئے کے چہرے پر سے کمبل اٹھایا اور بولی اسے چوم لو! اب وہ شخص بھی جو سویا ہوا تھا مردہ تھا۔۔۔۔ لڑکی نے مردے کے پاؤں کو چھوا تو یکدم کمبل اترا وہ مردہ ہوا میں معلق ہو گیا۔۔۔۔اس کے بال گھٹنوں تک لمبے اور بوسے جیسے تھے منہ میں دانت نہیں تھے اور وہ بوڑھی عورت کم از کم سو برس کی تھی۔۔۔۔ ہم دوسرے دن پھر وہاں گئے نہ محل تھا نہ جھونپڑا۔[۴]

اس کہانی کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں شوکت کی یہ کہانی اپنے ماحول کی پیداوار ہے ایسے ہی واقعات وہ روزانہ اس علاقے کے لوگوں سے سنتا رہتا تھا اور لوگ ایسی باتوں پر یقین بھی کرتے تھے۔تمام بچے بھی شوکت کی ان باتوں کو سچ مان لیتے ہیں۔کیونکہ مشرق کے لوگوں کا جنوں بھوتوں روحوں کی موجودگی پر بہت یقین ہے۔

شاہد مسلم تہذیب کا نمائندہ کردار ہے۔اپنے لباس، بول چال کے انداز، مذہبی اقدار اور روایات میں مسلم تہذیب کی نمائندگی کر رہا ہے۔اپنے بڑوں کا بے حد احترام کرتا ہے۔شاہد اپنے معاشرے کے اثرات لیے ہوئے ہیں۔ شگون اور بد شگونی پر بہت یقین رکھتا ہے۔کوئی بات ہو جائے تو وہ اسے برا شگون سمجھ لیتا ہے۔شاہد ایک روایتی بیٹے کا کردار ادا کرتا ہے جو اپنے باپ سے بہت دبتا ہے باپ کی ایک آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ہے لیکن اسے اپنی موٹی کالی بھدی ماں دنیا کی خوبصورت ترین عورت نظر آتی ہے۔وہ اپنی ماں کی ہر چیز پر اپنا حق جتاتا ہے۔بغیر اجازت اپنی ماں کی ہر چیز اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔

شاہد کے کردار میں اسلام کے ایک اہم رکن روزے کی تفصیلات ملتی ہیں۔رمضان کے مہینے میں دنیا بھر کے مسلمان روزے رکھتے ہیں۔روزہ کسی بیماری یا عذر کے بغیر چھوڑنا جائز نہیں ہے۔شاہد بھی اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق رمضان کے روزے رکھتا ہے۔ گرمی اور پیاس سے بے حال شاہد سارا دن اپنے کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ کرتا رہتا ہے۔پیاس لگتی ہے تو جا کر افطاری کے لئے برف کوٹ کر لیموں نچوڑ کر دیگچہ بھر کے شربت بنانا شروع کر دیتا ہے۔ دوپہر کے وقت ہی وہ افطاری کی تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔شاہد کے کردار میں بانو قدسیہ نے مسلم معاشرے کا عمومی رویہ دکھایا ہے۔روزے کی حالت میں لوگ گرمی سے بچنے کے لیے کمروں میں پانی کا چھڑکاؤ کرتے اور دن چڑھے

ہی افطاری کی تیاریاں مسلم گھرانوں میں شروع ہو جاتی ہیں-افطاری پر بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے اور شربت ہر گھرانے میں افطاری کے لوازمات کا اہم حصہ ہے-شاہد کے کردار میں رمضان میں رائج ایک رواج کی تفصیل ملتی ہے-

> آدھی رات کو کئی لوگ جگانے آتے ہیں۔۔۔آج کل کم از کم پانچ سات آدمی آتے ہیں رات کو۔۔۔۔ پہلے حضرت نے گھی کے خالی کنستر میں روڑے اکٹھے کر رکھے ہیں-انہیں کھڑکاتا اور چوب سے ٹین بجاتا ہے..... یہ روزے کے لئے جگانے والے بے دھڑک آتے ہیں..... عید کے روز انعام بھی لے کر جاتے ہیں..... پھر ایک اور حضرت آتے ہیں-یہ ہیں تو چھوٹے سے گھٹ مٹھیا سے مختنی لیکن بڑی کڑک دار آواز میں کہتے ہیں۔۔۔ہر دم مولا۔۔۔حق اللہ ہو۔۔۔ان کے بعد ایک ٹولی آتی ہے۔۔۔۔ گاتی ہوئی۔ فلمی گانوں کی دھنوں پر نعتیں فٹ کر کے گاتے ہیں۔۔۔۔ نعتیں پڑھنے والے 'ڈنڈے کوٹنے والے'....[5]

رمضان میں سحری سے پہلے کچھ لوگ آکر روزے کے لیے جگاتے تھے یہ رواج برصغیر میں رائج تھا اور آج تک ہمارے معاشرے میں رائج ہے-شاہد ایک مسلم تہذیب کا پروردہ کردار ہے اس کے ہاں مذہبی رسومات کے حوالے سے روزہ رکھنے اور سحری کھانے کا بیان ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسلم تہذیب میں پائے جانے والے اس رواج کا بھی ذکر ملتا ہے-آدھی رات کو ہی یہ لوگ محلوں میں نقارہ بجانا شروع کر دیتے ہی-ساری رات لوگ ان آوازوں سے پریشان سو نہیں پاتے لیکن ان کو کوئی منع نہیں کرتا-مذہبی لحاظ سے ان کو لوگ نیک فریضہ انجام دینا کہتے ہیں اور خوشی خوشی عید کے دن ان کو انعام بھی دیتے ہیں-

شاہد ناول کے مرکزی کردار راحیلہ کے منگیتر کا کردار ادا کرتا ہے-اپنی منگیتر سے ملنے کے لئے اس کے ہاسٹل جاتا ہے لیکن وارڈن اسے یہ کہہ کر منع کر دیتی ہے کہ والد اور بھائی کی اجازت درکار ہے-ہاسٹل میں مسلمان، سکھ، ہندو ہر مذہب کی لڑکیاں رہائش پذیر تھیں لیکن برصغیر کے کلچر کے مطابق لڑکیوں کو ہر ایرے غیرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی- مشرقی کلچر میں لڑکیوں کا غیر محرموں سے ملنا معیوب تصور کیا جاتا ہے-

شاہد ایک وجیہہ نوجوان ہے اس کی بہن کی دوست عابدہ اس کے آگے پیچھے پھرتی ہے جبکہ منگیتر راحیلہ فطری حجاب اور والدین کے اصرار پر اس سے کتراتی ہے-شاہد خوش شکل ہونے پر اتراتا ہے اور اس کو یہ بات اپنی توہین محسوس ہوتی ہے-بانو قدسیہ نے شاہد کے کردار میں مرد کی نفسیات اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے-مرد کو خوبصورت بنی سنوری اور پر اعتماد لڑکیاں ہی متاثر کرتی ہیں یسی لیے وہ عابدہ کی طرف کھچا چلا جاتا ہے اور اس وقت یہ نہیں سوچتا کہ اس کی اس حرکت سے راحیلہ کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں-

اس کی منگیتر راحیلہ کالج جاکر پر ااعتماد ہو جاتی ہے تو شاہد کو اس بات پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلوانی چاہیے وہ ایک ایسا مرد ہے جو عورت پر اپنی برتری چاہتا ہے- ایک طرف تو عابدہ کو دیکھ کر اس کی نیت میں فتور آجاتا ہے خود کو اس کی جانب بڑھنے سے روک نہیں پاتا لیکن راحیلہ سے یہ امید کرتا ہے کہ وہ صرف اس کی پوجا کرے- حالات کی ستم ظریفی کے سبب جب راحیلہ کی شادی کسی اور شخص سے ہو جاتی ہے شاہد راحیلہ کے گھر جاکر اسے ورغلاتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ جائے-اس کے شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہے کیونکہ وہ صرف شاہد کی ملکیت ہے-

شاہد کا کردار مسلم تہذیب کے ایک قدیم رواج کی عکاسی کرتا ہے-شاہد کی مہندی کے موقع پر اسے لڑکی والوں کے گھر جانے کی اجازت نہیں ہوتی-شاہد کی ماں خاص طور پر لڑکی والوں سے اجازت طلب کرتی ہے کہ وہ دولہا کو بھی مہندی میں شرکت کرنے کی اجازت دیں-شادی سے پہلے دولہے والے ہر بات میں لڑکی والوں کی مرضی کا خیال رکھتے ہیں اور شادی کے بعد لڑکی والے لڑکے والوں کے سامنے جھکے نظر آتے ہیں-آج بھی ہمارے معاشرے میں مہندی کے موقع پر صرف دولہا کی بہنیں اور گھر والے ہی شرکت کرتے ہیں-دولہے کو شادی سے پہلے کسی بھی رسم میں دلہن کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہ ہمارا مذہب دیتا ہے اور نہ ہی ہماری تہذیب میں یہ بات قابل قبول ہے-اسی طرح لڑکی بھی شادی سے پہلے اپنے سسرال نہیں جاتی-

ساجدہ بیگم کا کردار مشرقی تہذیب کا نمائندہ نسائی کردار ہے-ایک مشرقی عورت کی تمام خصوصیات صبر ،وفا، قربانی جیسی صفات اس کردار میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں-ساجدہ کی پرورش اکلوتی ہونے کی وجہ سے شہزادیوں کی طرح ہوئی جوانی میں وہ بہت دوستانہ مزاج کی حامل لڑکی کے کردار میں ابھرتی ہے-ساجدہ جب رخصت ہو کر سسرال آتی ہے اس کا شوہر انگلستان حصول تعلیمَ کے لیے چلا جاتا ہے-چھ سال تک واپس گھر کا رخ نہیں کرتا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی رابطہ کرتا ہے—ساجدہ مشرقی وفاشعار بیوی کی طرح شوہر کے خطوں کی راہ تکتی رہتی ہے-مصنفہ اس کردار کو مشرقی روایات کا استعارہ بنا کر اسے درپیش حالات وواقعات کی خوب ترجمانی کرتی ہیں۔

> چھ سال کا لمبا وقفہ-اس دوران اماں ساجدہ کے اندر کیسے کیسے لاوے نہ ابلے ہوں گے- کیسی ہیجان پرور کیفیات نے دم نہ توڑا ہو گا-اس بیراگ کے عہد کا انہوں نے کبھی کسی سے ذکر نہ کیا-ان کے چہرے پر کبھی شگفتگی نہ آئی-آنکھوں تلے مستقل حلقے پڑ گئے اور ہونٹوں کی کمان ٹھوڑی کی جانب جھک گئ-ڈاکٹر سرفراز جب لندن سے آئے تو ان کی وجاہت اور بھی بڑھ گئی تھی۔۔۔۔ایسے انگریز سے بھلا کیسا جھگڑا۔۔۔۔ بالوں میں ان گنت سفید بال اور دل میں حافظ کی کئ ساکت غزلیں اٹھائے اماں

ساجدہ کاموں میں مصروف رہتی تھی۔[۷]

ساجدہ ملنسار طبیعت کی مالک اور مضبوط کردار کے طور پر نظر آتی ہے۔اس کا شوہر انگلستان جا کر اس سے ہر رابطہ منقطع کر لیتا ہے— وہ ایک باوفا بیوی ہے جو شوہر کی غیر موجودگی میں بھی اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔شوہر کے واپس آنے پر وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی وہ ہر طرح کے حالات میں سمجھوتہ کرنے پر تیار ہے۔اس کردار کی صورت میں مصنفہ مشرقی روایات کی پاسداری کو بیان کرتی ہیں۔ شوہر کے پاس انگریز عورت کی تصویر دیکھ کر وہ فطری رقابت کا شکار ہوتی ہے لیکن زبان پر حرف شکایت نہیں لاتی خود کو حالات کے دھارے پر بہا کر راضی رہتی ہے۔ساجدہ کا کردار ایک روایتی مشرقی عورت کا کردار ہے جو ہر طرح کے حالات میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس معاشرے میں شوہر کے بغیر اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ساجدہ سفید رنگ و روپ بھاری بھر کم جسم کی مالک ایک مکمل گھریلو عورت ہے۔جس کا سارا وقت گھر کے کام کاج میں گزرتا ہے۔شلجم گوبھی کریلوں کو خشک کر کے ان کے ہار پروتی رہتی ہے وہ اچار ڈالنے کی بھی بہت شوقین تھی۔ہر وقت کھانے پکانے کی چیزوں کی ترکیبیں سیکھتی رہتی ہے۔

> تلوں پر کاغذ چپکا کر جلی حروف میں لکھتیں کس میں دھنیا ہے' کس میں سفید زیرہ' کس بوتل کو کھولیں تو ثابت سرخ مرچیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ پھر مرچ مسالے کی بوتلیں' آٹے کے ٹین' سبزیوں کی ٹوکریاں' روٹیوں کے چھابے' چھوٹی جیسے بڑی دیگچیاں' کھلی بڑی کڑاہیاں' آٹے' چاول کے ٹین' گندم کی بوریاں' گھی کا کنستر' اچار کے مرتبان' چینی کے ٹین' دار جیلنگ چائے کا ڈبہ' استعمال کے چمچ کانٹے' پلیٹیں پلیٹر' چائے کے برتن' ٹرولیاں سب دھو دھا کر سجائی جاتیں۔۔۔[۸]

مشرق کے باسی بارشوں کے بعد جب تیز دھوپ نکلتی ہے تو گھر کے سامان کو دھوپ لگواتے ہیں ساجدہ نے برسوں پرانے سامان کو سینت سینت کر رکھا ہوتا ہے اپنی شادی کا غرارہ تک سنبھال کر رکھتی ہے اتنے برس گزرنے کے باوجود بھی وہ ہر سال اپنے غرارے کو دھوپ لگواتی اور دوبارہ پیک کر کے رکھ دیتی ہے۔کپڑے جوتے کتابیں کھیس رضاہیاں قالین ان سب چیزوں کو دھوپ لگواتی ہے۔سامان کو دھوپ لگوانا مشرقی کلچر کا حصہ بن چکا ہے کیونکہ بارشوں کے بعد سامان کو پھپھوندی لگ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔یہ کردار اپنی روایات اور تہذیب و ثقافت سے جڑا ہوا ہے ناول کے اس کردار کے رویوں سے تہذیبی و ثقافتی اظہار کا بیان ملتا ہے۔

ساجدہ مشرقی تہذیب کا پروردہ کردار ہے اپنے طور اطوار سے وہ اپنی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے۔مشرقی تہذیب میں سسر کا احترام لازم ہے۔ساجدہ اپنے سسر کی آواز سنتے ہی سر پر دوپٹہ لے لیتی ہے اور ادب سے نگاہیں جھکا

کر بات کرتی ہے- سسر کے سامنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کرتی ساجدہ کبھی بھی اپنے سسر سے فرمائش کر کے کوئی چیز نہیں منگواتی-اپنے بچوں کو بھی نصیحت کرتی ہے کہ ماں باپ کا حکم ماننا فرض ہے اور دادا ابا تو سب سے بڑے ہیں ان کی بات سب سے پہلے مانا کرو خود بھی اپنے سسر کا احترام کرتی ہے اور اپنے بچوں کی بھی یہی تربیت کرتی کہ گھر کے بزرگ کا کہا مانیں-

اسلامی تہذیب کے مطابق اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے نقاب کرتی ہے، نمازوں کی پابندی کرتی ہے، تسبیحات پڑتی اپنی بیٹی کو بھی پردہ کرنے کا کہتی ہے اپنی بیٹی کو نصیحت کرتی ہے کہ ہمارے مذہب میں زیبائش کا حکم نہیں ہے اپنی بیٹی کو سر پر دوپٹہ اوڑھنے کی عادت بچپن سے ہی ڈالتی ہے اور بالغ ہونے پر اسے برقعہ پہننے کے لیے دیتی ہے-اس کردار کے ہر عمل سے تہذیبی و ثقافتی وابستگی کا احساس جنم لیتا ہے۔

ساجدہ اپنے خاندان کے ساتھ ایک ایسے علاقے میں رہائش پزیر ہوتی ہے جہاں مسلم اکثریت میں ہیں مسلمانوں کے تمام مذہبی تہوار عید، شب برات، محرم پورے جوش و خروش اور عقیدت کے ساتھ منائے جاتے ہیں- عہد کریمہ کا ختم شریف کرواتے ہیں وہ مکمل مذہبی ماحول میں رہتی ہے اپنے جیسے لوگوں میں رہ کر کر ساجدہ خوش ہے محض اپنے شوہر کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایک ایسے علاقے میں منتقل ہو جاتی ہے جہاں ہندو اکثریت میں ہیں- ساجدہ اپنوں سے بچھڑنے پر افسردہ بھی ہوتی ہے لیکن وہ شوہر کی بات سے اختلاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی اور چپ چاپ اس کی خواہش پر عمل پیر ہوتی ہے-ساجد اپنی پسند و ناپسند کو اہمیت نہیں دیتی اپنی خواہشات کو پس پشت ڈال کر ساری زندگی سمجھوتے پر بسر کر دیتی ہے-

ساجدہ بیگم ایک وفاشعار بیوی کا کردار ادا کرتی ہے-ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے سمجھے جاتے ہیں زندگی کی گاڑی چلانے میں دونوں کو برابر کا کردار ادا کرنا چاہیے اور اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانی چاہیے لیکن مشرقی کلچر میں ایسا نہیں ہوتا گھر کی ذمہ داری، بچوں کی تعلیم و تربیت، سسرال والوں کا خیال عورت سے منسوب کیا جاتا ہے-مرد کو کھلی آزادی حاصل ہوتی ہے وہ جہاں چاہے رہے اپنا وقت جہاں چاہے گزارے -ناول میں ساجدہ ایک ایسا ہی کردار ہے جو اپنی خواہشات کا گلا گھونٹے چپ چاپ زندگی گزار رہی ہے اس کا شوہر سب ذمہ داریوں سے بری الزمہ ہے- مشرقی کلچر میں خاوند محض بیوی کو نان و نفقہ ادا کر کے ہی ہر قسم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے-

اسلامی تہذیب کا نمایاں کردار ہونے کے باوجود ایک مخلوط معاشرے میں رہتے ہوئے ساجدہ پر اس معاشرے کا گہرا اثر ہوتا ہے- بیٹی کی شادی کے موقع پر اس کا سارا وقت زیورات بنانے جہیز اکٹھا کرنے میں گزر جاتا

ہے-اسلام میں شادی سادگی کے ساتھ کرنے کا حکم ہے-ساجدہ شادی کو ایک فریضہ سمجھنے کے بجائے نمود و نمائش کا ذریعہ سمجھتی ہے-بیٹی کی شادی پر وہ بازاروں کے چکر لگاتے نہیں تھکتی اس کا مقصد محض نمود و نمائش ہوتا ہے-شادی کے موقع پر رشتہ داروں کو سارا جہیز کھول کھول کر دکھاتی ہے-اس کردار پر اپنے ماحول کا گہرا اثر ہے وہ توہم پرست ہے اور ذرا ذرا سی بات کو بدشگونی سمجھ کر گھبرا جاتی ہے-مشرقی عورتوں کی طرح واہمات کا شکار ہوتی ہے بیٹے کی معمولی بیماری پر وہ اس جگہ کو آسیب زدہ سمجھتی ہے-توہم پرست ہے کسی بھی واقعے کا ذمہ دار وہ جنوں بھوتوں اور آسیب کو ٹھہرا دیتی ہے-

راحیلہ کا کردار ایک مغل لڑکی کا ہے جس کی تربیت گھر کے بزرگ اسلامی تہذیب کے مطابق کرتے ہیں-راحیلہ اپنی مذہبی روایات پر سختی سے کار بند ہے-بچپن سے ہی دوپٹہ اوڑھتی اور بالغ ہونے پر برقعہ پہنتی ہے-صبح سویرے جاگتی ہے مشرقی کلچر میں میں صبح سویرے جاگنا اچھی صحت کی علامت سمجھا جاتا ہے-فجر کی نماز پڑھتی ہے اور اپنی دینی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے-راحیلہ کی والدہ بچپن ہی سے اسے بڑوں کا احترام کرنا سکھاتی ہیں-راحیلہ چھوٹا بڑا ہر کام اپنے بزرگوں کی اجازت سے کرتی ہے-کہیں آنا جانا ہو تو پہلے اپنے بڑوں سے اجازت طلب کرتی ہے-جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس پر کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے اپنی والدہ کے ساتھ کمرے میں سوتی ہے-

مشرق میں لڑکیوں پر اکیلے کہیں بھی آنے جانے پر پابندی عائد کی جاتی ہے--راحیلہ جب بازار جاتی ہے اپنے بھائی کے ساتھ جاتی ہے-راحیلہ کے کردار میں مشرق میں کھیلے جانے والے کھیل جو بچے اکثر گھروں میں کھیلتے ہیں لوڈو گھر گھر کھیلنا گڑیا گڈے کی شادی کے کھیل نظر آتے ہیں-مشرقی کلچر میں لڑکوں سے ملنا جلنا ناپسند کیا جاتا ہے اور مخلوط تعلیمی نظام کو بھی ناپسند کیا جاتا ہے-راحیلہ کے گھر کے بزرگ بھی اسے لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے منع کرتے ہیں-راحیلہ اپنی روزمرہ زندگی کے تمام معاملات میں اپنے دین کے مطابق چلتی ہے ڈر یا خوف کے موقع پر وہ آیت الکرسی کا ورد کرتی ہے اس کا اس بات پر ایمان ہے کہ آیت الکرسی پڑھنے سے اس کا ڈر ختم ہو جائے گا-اس کی تربیت دینی اصولوں کے مطابق ہوتی ہے-گھر کے بزرگوں سے خودداری اسلامی اقدار کی پابندی اور اپنی ماں سے وہ وفا شعاری سیکھتی ہے-راحیلہ کے کردار میں مشرقی کلچر میں ہونے والی شادی کی تمام رسومات مایوں بیٹھنے کی رسم، مہندی کی رسم، ڈھولکی، شادی کے لیے زیورات بنوانا، جہیز کا سامان تیار کرنا، نکاح اور رخصتی کا بیان ملتا ہے-راحیلہ کی مہندی کی رسم کو بانو قدسیہ یوں بیان کرتی ہیں:

> راحیلہ کیسری لباس میں ملبوس پھولوں کا زیور پہنے خالی الذہن کئی باتیں سوچنے میں مشغول تھی---اس نے شامیانے کے اندر قالینوں پر کرسیوں پر بیٹھی عورتوں لڑکیوں بچیوں پر نظر

ڈالی۔۔۔۔ماہیا کے بول ڈھیلے ڈھیلے اور بے سرے رہے تھے۔ڈھولک بے تال بج رہی تھی.....
تھوڑی دیر میں شاہد کے گھر کی عورتیں مہندی لے کر آنے والی تھیں....راحیلہ نے کیسری دوپٹے
کے گھونگھٹ میں سے نگاہیں پھرا کر دیکھا۔۔۔۔قطار میں کھڑی لڑکیوں نے پھول برسانا شروع کر
دیے۔مہندی کے تھال لئے سسرال والیاں جیوے بنرا عمراں ساریاں گاتی ہوئی داخل
ہوئیں۔۔۔۔گوٹے لگے دوپٹے کا چھپر کھٹ بنائے راحیلہ ہاتھ گودی میں لیے بیٹھی تھی۔بیگم عباس
نے بڑی پریت سے اس کے ہاتھ پر پان کا پتہ رکھ کر مہندی کا شگن کیا اور اوما کی تھالی میں سے گلاب
جامن اٹھا کر اس کے منہ میں رکھا۔[8]

بانو قدسیہ نے مہندی کی رسم کو پوری جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔راحیلہ مشرقی لوگوں کی طرح شگون بدشگونی کی باتوں کو خود سے علیحدہ نہیں کر پاتی اپنے آباءواجداد سے یہ باتیں سنتے سنتے اس کے لاشعور کا حصہ بن گئیں۔مشرق میں شگون اور بدشگونی کا رجحان بہت زیادہ پایا جاتا ہے اس کا عکس اس کردار کے رویوں میں نظر آتا ہے۔ بچے بڑوں سے سنتے سنتے ان باتوں پر یقین کرنے لگتے ہیں اور یوں روایات کی منتقلی ایک نسل سے دوسری نسل میں ہوتی ہے۔

راحیلہ کی والدہ شگون بدشگونی کی باتوں پر بہت یقین رکھتی تھیں یہی وجہ ہے کہ راحیلہ کے اندر بھی وہم شگون بدشگونی کی باتیں رچ بس جاتی ہیں۔راحیلہ کا کردار ایک نہایت وہمی لڑکی کا کردار ہے جو معمولی سے معمولی واقعے پر بھی توہمات کا شکار ہو جاتی ہے کہیں جاتے وقت سوٹ کیس بھی اگر بند نہ ہو تو وہ اسے برا شگون سمجھتی ہے۔فجر کے قریب کوئی خواب دیکھے تو اسے سچ سمجھ بیٹھتی ہے۔اس کے لاشعور میں وہ باتیں ہیں جو وہ اپنے آباءواجداد سے بچپن سے ہی سنتی آئی تھی کہ فجر کے قریب جو خواب دیکھا جاتا ہے وہ حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔راحیلہ کے ذہن میں بھی یہی خدشات پل رہے ہوتے ہیں۔

صبح تمہاری کانچ کی زرد چوڑیاں ٹوٹ نہیں گئیں تھیں؟ کیا دودھ کا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر
نہیں گرا تھا...کالی بلی تمہارے عروسی جوڑے سے نہیں نکلی کل رات..[9]

راحیلہ ایک باوفا بیوی اور مثالی ماں کے روپ میں نظر آتی ہے۔حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے راحیلہ کی شادی اس کے منگیتر سے نہیں ہو پاتی اپنے منگیتر سے شدید محبت کرنے کے باوجود اپنے شوہر کو اس پر ترجیح دیتی ہے۔ منگیتر کے دوبارہ زندگی میں آجانے سے اس کی طرف پلٹتی نہیں ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی حتیٰ کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی کسی دوسرے شخص کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کرتی۔اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لیے

وقف کر دیتی ہے- یہ ایسا کردار ہے جس کے رویوں سے اس کی تہذیبی و ثقافتی وابستگی کے عوامل کی جھلک نظر آتی ہے۔

تسنیم کا کردار ایک ایسی مشرقی لڑکی کا کردار ہے جو شرم و حیا کا پیکر سگھڑ، سلیقہ شعار، صابر، سعادت مند ہے ہر وقت دوسروں کی خدمت میں مصروف رہتی ہے- بانو قدسیہ نے تسنیم کو ایک مثالی کردار کے طور پر تخلیق کیا ہے یہ کردار بہت سی خوبیوں سے متصف ہے- تسنیم خدمت اور محبت کی مٹی سے گندھی ہوئی ہر وقت دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہتی ہے خدمتِ خلق اس کی مذہبی تعلیمات کا حصہ ہے-

> تسنیم کو نہ کبھی سردی لگی نہ گرمی-کاموں نے اسے اپنے آرام و آسائش سے بے پرواہ رکھا۔۔۔دوپہر کا وقت بڑی فراغت کا ہوتا-اس وقت وہ بڑی پیٹی کھول کر راحیلہ کے جہیز کی چیزیں بڑی دری' پلنگ اور صوفے پر بچھا رکھ کر انہیں جانچتی پرکھتی....اپنے ہاتھوں غرارے' قمیض' شلواریں سیتی تھیں- گوٹا کناری سلمی ستارہ۔.... تسنیم آپا کے کمرے میں راحیلہ کا سارا جہیز تھا- بڑی پیٹی میں پلش اور مخمل کی رضاعیاں' کمبل' کھیس چادریں' بیڈ کور تھے- سلائی کی مشین' زینتھ کا ریڈیو' گارڈن فین دیوار کے ساتھ ساتھ دھرے تھے۔ ساری دوپہر تسنیم دوپٹوں کو گوٹا کناری سلمی ستارہ ٹانکنے میں بسر کرتی۔ [1]

اس کی ان خوبیوں کی وجہ سے جو کہ اس کی تہذیب کا حصہ ہیں ہر کوئی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے- تسنیم کے کردار میں برصغیر کی ایک اہم رسم جہیز کا بیان ملتا ہے- صدیوں سے رائج یہ رسم آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے- گھر کا سارا سامان اور ضرورت کی تمام اشیاء لڑکی والدین کے گھر سے لے کر آتی ہے- ہندو مذہب میں لڑکی کو صرف جہیز دیا جاتا ہے وراثت میں حصہ نہیں آج کل ہمارے ہاں بھی یہی نظام چل پڑا ہے جہیز دیتے ہیں تو پھر وراثت میں حصہ دینے کی ضرورت نہیں- دین اسلام میں عورت کو وراثت میں حصہ دینے کی تلقین ہوئی ہے جہیز دینے کا کوئی بیان نہیں ملتا- ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیٹی کو شادی کے موقع پر چند چیزیں دیں تھیں-

تسنیم عین جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہے اور اس کی خوبیوں کی وجہ سے بہت سے لوگ بیوہ اور ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود اس سے رشتہ جوڑنے کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے مرحوم شوہر سے وعدے کی پاسداری کرتی ہے کہ اس کے گزر جانے کے بعد بھی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ تسنیم اپنی ساری زندگی اپنے مرے ہوئے شوہر کا عہد نبھاتے گزار دیتی ہے اور اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لیے وقف کر دیتی ہے- دین اسلام میں بیوہ کو شادی کی اجازت ہے- نکاح کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سنت قرار دیا ہے اور اسے ایک پسندیدہ عمل بتایا ہے

لیکن تسنیم کسی سہارے کی متلاشی ہونے کے باوجود اپنی ساری عمر مرے ہوئے شوہر کا قول نبھاتے گزار دیتی ہے۔

ایڈووکیٹ غلام عباس کی بیوی بیگم عباس ناول کا ایک ضمنی کردار ہے۔ بیگم عباس کی بے ترتیب زندگی ان کے اپنے حلیے سے صاف ظاہر ہوتی تھی آرام طلب ہونے کے باعث اپنے حلیے کو سنوارنے کا تردد نہیں کرتی۔ گھر بکھرا پڑا رہتا بکھرے بال، دن چڑھے تک سوتی رہتی سارا سارا دن آنکھوں سے نیند کا خمار نہ جاتا جمائیاں لیتی رہتی ہے۔ سارا دن پلنگ پر کپڑوں کے ڈھیر کی طرح پڑی رہتی۔ گھر کے تمام کام نوکروں سے کرواتی باورچی خانے میں جا کر کھانا چکھنے کی بھی کبھی زحمت نہیں کرتی وہ بھی اپنے بیڈ روم میں لیٹے لیٹے منگواتی ہے۔ ان عادات کی وجہ سے اس کا موٹاپا بہت بڑھ گیا تھا اور موٹاپے نے بیماری کی صورت اختیار کر لی تھی۔ جہاں کہیں کسی ڈاکٹر کو دیکھتی اپنی بیماریوں کو رونا لے کر بیٹھ جاتی اور اپنی بیماریوں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتی۔

> ڈاکٹر صاحب پوری توجہ سے استغفار میں مشغول ہو گئے۔ "آپا جی وہ آپ کو جو میڈسن دی تھی اس سے کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ گھنٹیا کے لئے تو اکسیر ہے۔ کیلسیم ٹیبلٹ بھی ضرور کھایا کریں۔۔۔۔۔ دراصل یہ مرض حیاتین کی کمی سے ہوتا ہے۔
>
> بیگم عباس بڑی نخریلی۔۔۔ تڑپ کر گویا ہوئیں۔ بھائی صاحب! چاہے کسی طرح ہو' ہمیں تو نجات چاہیے اس مرض سے۔۔۔ علاج بھی ایسے ہیں کیے جاؤ مسلسل تو درد کو افاقہ۔ آج دوا روکو۔۔۔ کل مرض پھر حاضر۔۔۔ میں تو اسپرین اور سوڈا سالسلیٹ کھا کھا کر عاجز آ گئی ہوں سچ!"
>
> ڈاکٹر سرفراز مغل نے فرش پر نظریں جما کر لجاجت سے کہا۔۔۔ اس بیماری میں ذرا ٹہلنا اچھا ہوتا ہے۔۔۔ آپ۔۔۔ اور کچھ نہیں تو گیلری میں ہی۔۔۔
>
> بیگم عباس چوکنی ہو کر تڑپتیں۔ ہائے بھائی صاحب! بہت ٹہلتی ہوں۔۔۔ پر کیا کروں۔ گھر کے کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملتی۔۔۔ ان دھندوں سے فراغت ہو تو سیر کو جاؤں۔۔۔ ہمارے پڑوس میں جو مسز لکشمی بھاٹیہ ہیں ناں' انہوں نے حکیم اجمل خان کا ایک صدری نسخہ دیا ہے' وہ آزما رہی ہوں۔۔۔ ہار سنگار کی کلیاں ابال کر ان میں۔[11]

درج بالا مکالمے سے بیگم عباس کی فطرت کا پتہ چلتا ہے۔ موٹاپے کی وجہ سے معدے کے امراض کا شکار ہوتی ہے کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ موٹاپے کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی دشوار ہوتا ہے لیکن پھر بھی احتیاط کا دامن نہیں پکڑتی۔ بیگم عباس کا شمار ان عورتوں میں ہوتا ہے جو ڈاکٹروں کے سامنے اپنی بیماریوں کا رونا تو ضرور روتی ہیں لیکن ڈاکٹروں کے نسخوں پر عمل نہیں کرتی اور نہ ہی ان کی دی گئی ادویات کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کا یقین حکیموں پر بہت ہے ان کے نزدیک حکیمی پڑیا کھانے سے ہی ان کی تمام بیماریاں دور ہو جائیں گی۔ حکیمی نسخے آزمانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ

اس کے لیے کچھ محنت درکار نہیں ہوتی-ڈاکٹر جب اسے چہل قدمی کا کہتا ہے تو فوراً اس بحث کو سمیٹ کر اپنے پسندیدہ سلائی کڑھائی کے موضوع پر بات کرنا شروع کر دیتی ہے-

بیگم عباس خود تو ایک بدسلیقہ عورت ہے اس کا سارا وجود بے ترتیبی کا شکار ہے لیکن وہ ایک مثالی ماں کا کردار ادا کرتی ہے-اپنے بچوں کی طرف سے ہر لحہ فکر میں رہتی ہے اس کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی سلائی کڑھائی میں ماہر ہو-خود تو بیگم عباس سلیقہ شعار نہیں ہوتی لیکن سلیقہ مند لڑکیوں کو بہت پسند کرتی ہے-وہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی کشیدہ کاری 'لیس اور نٹنگ کے کام سیکھے، سلائی کڑھائی میں ماہر ہو اور ہر وقت باورچی خانے میں ہی پائی جائے- بیگم عباس اسلامی تہذیب سے تعلق رکھنے والا کردار ہے اپنے بچوں کو اسلام علیکم کہہ کر مخاطب کرتی- جس کسی سے ملتی جیتی رہو کہہ کر دعائیں دیتی-ایک مشرقی ماں کے دل میں پلنے والے وہمات بانو قدسیہ نے اس کردار میں دکھائے ہیں اس کے لئے تعلیم اتنی ضروری نہیں جتنا کہ بچوں کا نکاح ضروری ہے وہ جلد از جلد اپنے بچوں کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہے-اس کو ہر وقت یہ خدشہ لاحق ہوتا ہے کہ لڑکیاں کہیں میرے بیٹے کو لے نہ اڑیں-

ٹھاکر چندر سین ہندو مذہب کا نمائندہ کردار ہے یہ کردار اپنے لباس، زبان اور نظریات سے ہندو تہذیب کی عکاسی کر رہا ہے- بانو قدسیہ نے اس کردار کے حلیے کی بڑی کامیاب تصویر کشی کی ہے-

> کھدر کا اچکن نما کرتا' نیچے دھوتی' پاؤں میں بند جوتی' کندھے پر تہہ کی ہوئی گرم پشمینے کی چادر' نہرو جیکٹ اور کیپ اور گول چہرے پر گول عینک۔۔۔۔۔ ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔۔۔ مہاراج آداب۔۔ [۱۲]

ٹھاکر چندر سین کے طور اطوار، رہنے سہنے کے انداز ہندو کلچر کے ترجمان ہیں- ٹھاکر چندر سین کے لباس سے ہی اس کے مذہب کا پتہ چلتا ہے-لباس سے ہی مختلف مذاہب کے باشندوں کی تفریق ہوتی ہے-اگر سب ایک جیسا ہی لباس زیب تن کرنے لگ جائیں تو ان کا جداگانہ تشخص باقی نہیں رہتا-لباس ہر مذہب کے لوگوں کو انفرادیت بخشتا ہے- مختلف مذہب کے لوگوں کا لباس بناوٹ کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے اور ان کے مذہبی اصولوں کے عین مطابق ہوتا ہے-ٹھاکر چندر سین کوئی کٹر ہندو نہیں ہے وہ ایک لبرل ہندو ہے اور مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کو برا نہیں سمجھتا-اس کا خیال ہے کہ وہ اپنے اخلاق سے مسلمانوں کو متاثر کر کے اپنے مذہب میں شامل کر سکتا ہے-ہر بات کو بھگوان کی کرپا سمجھنے والا یہ کردار اپنے ذہن میں یہ خیال بسائے ہوئے ہے کہ اگر دوسرے مذاہب کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھیں تو وہ بھی ہندو مذہب میں شامل ہو سکتے ہیں-اس کا نظریہ ہے کہ ہندو مذہب میں اتنی وسعت ہے کہ ایک خدا اور ہزاروں بت بیک وقت اس میں سما سکتے ہیں-اس کردار کے ملنے جلنے کے آداب، نشست و برخاست

سب ہندو تہذیب کے مطابق ہیں۔

ٹھاکر بڑے دھیرے سے مسکرائے اور بولے۔۔۔۔۔ناری کے من میں اشانتی بہت ہے۔اسی لیے یہ کسی سے پریم کرے تو ٹھیک رہتی ہے ورنہ جو پریم نہ ہو تو سوچتی سمجھتی کچھ نہیں۔بڑے کشٹ اٹھائے گی پریم کی چنتا میں 'پریم کی خاطر ستی ہو جائے گی..... جہاں پریم نہ ہوگا وہاں اشانت ہو جائے گی۔خود بھی اشانت رہے گی اور دوجے کو بھی اشانتی دے گی۔[13]

بانو قدسیہ نے ٹھاکر چندر سین کے اس مکالمے کے ذریعے ہندی زبان میں ہندو عورت کے خصائص کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ہندو عورت اپنے مذہب میں بہت کٹڑ ہوتی ہے۔محبت کی خاطر ستی بھی ہو جاتی ہے اور اگر محبت نہ ہو تو نہ خود خوش رہتی ہے اور نہ کسی کو رہنے دیتی ہے۔ٹھاکر چندر سین ایک مذہبی آدمی اور اپنی تہذیب و ثقافت کا علمبردار کردار ہے۔

گھنیارا روڈ پر۔۔۔شمشان بھومی سے کچھ پہلے ایک رشی جی رہتے ہیں۔دس سال کی سمادھی کے بعد انہوں نے درشن دیے ہیں۔۔۔رشی گوپال داس سے مل کر آپ کا دل پرسن ہو جائے گا۔۔بھگوان کے سیوک لوگ سچے سیوک۔۔ایسے ہیں جیسے چودھویں کا چندرماں 'خود بھی اشانت۔۔دوسرے کو بھی اشانت رکھنے کی اچھیا۔۔کسی کو پاس نہیں آنے دیتے۔۔۔میں نے ایک دن ان کا ابرن چھو لیا'آپ مانیں نہ مانیں کئی دن بڑی بھلی سوگندھ آتی رہی اپنے ہاتھ سے۔[14]

سریندر ہندو کردار ہے اس کردار کے رویوں میں ہندوؤں کے عقائد و نظریات اور تہذیبی و ثقافتی اظہار کا بیان ملتا ہے۔اپنے ہندو عقیدے کے مطابق وہ پرندوں کے انڈے چرانے کو بہت بڑا گناہ تصور کرتا ہے۔سریندر کے ملنے جلنے کا انداز اس کے مذہب کے عین مطابق ہے جب بھی کسی سے ملتا ہے پرنام کہہ کر ملتا۔کرشن کنہیا کے انداز میں کھڑا ہوتا۔اس کے عقائد کی ترجمانی اس مکالمے میں ہوتی ہے۔

سریندر نے آہستہ سے شوکت کے پاس ہو کر کہا

میں رشی جی کے پاس گیا تھا۔انہوں نے یہ تین پتے دیے ہیں۔بس تین دن پی لینا' کبھی بخار نہ ہوگا۔

"تین پتے؟"شوکت نے بجھی آواز میں پوچھا۔

ہاں تین پتے۔۔ایک تلسی کا ہے 'ایک کینتھ کا ایک پوکلپٹس کا۔ملا کر پینے سے ملیریا شمشان بھومی پہنچ جاتا ہے۔۔[15]

سریندر کی والدہ کا بچپن میں انتقال ہو جاتا ہے گھر میں کوئی بھی اس پر توجہ نہیں دیتا جس کا اثر اس کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔یہ ایک حساس کردار ہے شمشان بھومی میں کھڑے ہو کر شاعری کرتا ہے۔اپنے ہی گھر میں نظر انداز

کیا جانا اسے اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے- سریندر کے گھر کا سارا انتظام اس کی بیوہ پھوپھی کے ہاتھ میں ہوتا ہے- والد کی صرف یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ہر سال ربیع اور خریف کی فصل کا سارا اناج گھر میں رکھ دیں ان کے نزدیک بچوں کے لئے یہی کافی تھا- مناسب توجہ اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے سریندر نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ اپنی کزن کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے- چھوٹی عمر میں ہی وہ جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو جاتا ہے ایک دیوی کی طرح اسے پوجتا ہے اور اس بات پر روتا رہتا ہے کہ اس کے مذہب میں کزن سے شادی کی اجازت نہیں ہے- ہندو مذہب میں کزن آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں اور کسی صورت ان کی شادی ممکن نہیں ہوتی- بیمار مریل سے سریندر کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا- ہر وقت اکیلا بیٹھا رہتا اس کے لئے گھر کے کسی فرد کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا- اس ماحول کا سریندر کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے- شاعر بننے اور اپنا نام کمانے کا بھوت اس قدر سوار ہوتا ہے کہ وہ گھر سے بھاگ جاتا ہے-

بوا ایک ہندو بچے کا کردار ہے- اس کے والدین کام کی غرض سے برما سدھار جاتے ہیں- ناول میں بوا ایک سنہری نیلی آنکھوں والے ایک پیارے سے بچے کا کردار نبھاتا ہے- اس کی سفید رنگت کے باعث سب اسے انگریزی باوا کہتے تھے اور جو کوئی بھی اسے دیکھتا پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا- بوپر اپنے معاشرے اور مذہب کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے- وہ ایک ہندو بچہ ہے ہندو گوشت نہیں کھاتے اس بچے کے ہاں بھی اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ ہم گوشت نہیں کھا سکتے اور بہت سی خود ساختہ باتوں اور توہمات کا اظہار ملتا ہے۔

"آہا جی آہا گیدڑ گیدڑی کا بیاہ"! بو نے خوشی سے تالیاں بجا کر کہا-

"ہاں سورج نکلا ہے پر بوندیں تھوڑا پڑ رہی ہیں"- راحیلہ نے ٹوکا-

"پڑ رہی ہیں دیدی پڑ رہی ہیں" کھڑکی کھول کر بو نے انگور کی بیل ہلور کر کہا- بارش تھوڑی دیر بھی برسے تو بیل پر سے دیر تک بوندیں برستی رہتی تھیں-

چلو آؤ سونا ڈھونڈنے چلیں۔۔۔[16]

بچوں کے اس مکالمے میں بو کے نظریات اس کی تہذیب و ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں اسے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ سونا ضرور نکلے گا- بو اپنی عمر سے بڑی لڑکیوں کو دیدی کہہ کر مخاطب کرتا ہے یہ لفظ اس کی تہذیب و معاشرت کا حصہ ہے- بو ایک نرم و نازک بچہ ہے جو بات بات پر آنسو بہاتا ہے شرمیلا اس قدر کہ ذرا سی بات پر اس کا چہرہ گلابی ہو جاتا- اس کے کئی خواب تھے کبھی لیفٹیننٹ بننے کا سوچتا، کبھی پائلٹ، کبھی جنگ میں جانے کا سوچتا اور خود ہی اپنے مر جانے کے خوف سے آنسو بہاتا رہتا ہے- بو کے ذہن پر ایئر فورس میں جانے کا خبط سوار ہو جاتا ہے- بو کے

اوپر دوسروں کے نظریات کا بہت اثر ہوتا ہے اس کی اپنی قوت ارادی بہت کمزور ہوتی ہے-ایئر فورس میں جا کر بھی دوسروں کے بہکاوے میں آکر اپنے لیے غلط راہ منتخب کرلیتا ہے-

اوما کسم نالنی اپنی تہذیب کی عکاسی اپنے لباس، طور اطوار، ہندی زبان اور عقائد و نظریات سے کرتی دکھائی دیتی ہے-ہندوانہ لباس ساڑھی پہنتی ہے جس کا ایک پلو وہ آگے سرکائے رکھتی ہے اس کے لباس سے اس کی تہذیبی وابستگی عیاں ہوتی ہے۔ ہندی زبان بولتی ہے لسانی حوالوں سے تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار اس کردار میں ملتا ہے- ملتے وقت اپنی تہذیب کو مد نظر رکھتے ہوئے جے رام کہہ کر ملتی ہے یہ کردار ہر حوالے سے اپنے رویوں سے تہذیبی و ثقافتی وابستگی چاہتا ہے-اوما اپنے مذہبی امور پر ہر طرح کے حالات میں سختی سے کاربند رہتی ہے چاہے کتنی ہی مصیبت میں مبتلا کیوں نہ ہو جائے کسی کو دیا گیا وچن نہیں توڑتی چاہے نقصان کا اندیشہ ہو-گائے کو ماں کا درجہ دیتی ہے اور گائے کا گوشت کھانا کبیرہ گناہ سمجھتی ہے-زندگی کے تمام معاملات میں اپنے مذہبی امور کو مد نظر رکھتی ہے-پرندوں کو پکڑنا اور ان کا شکار کرنا اس کے نزدیک کبیرہ گناہ ہے اور ان کو پکڑنے سے شراپ ملتا ہے-اس کا عقیدہ ہے کہ شام کے وقت تمام جانور عبادت کے لیے جاتے ہیں ان کو اس وقت مارنا بہت بڑا گناہ ہے-

اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق گانا بجانا سیکھتی اور بھجن گاتی ہے-اوما کا عقیدہ بھگوانوں پر بہت پختہ ہے اپنی کسی بھی حاجت کو لئے بھگوانوں کے آگے وہ ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر کے اس یقین کے ساتھ دعا مانگتی کہ اس کو وہ چیز ضرور مل جائے گی- بھگوان سے بنتی کرتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ بھگوان کی تعریف بیان کرتی رہتی اور اپنی عرضی بھی پیش کرتی جاتی اور بھگوان کو ان کے عزیزوں کے واسطے بھی دیے جاتی-اپنی عرضی پیش کرنے کے بعد وہ اس یقین کے ساتھ مطمئن ہو جاتی کہ بھگوان نے اس کی بات سن لی ہے اور وہ اس کی بات مان لیں گے-اوما کے ہاں ہندوؤں کا جنم جنم کا عقیدہ بھی ملتا ہے اور گندھراب بیاہ کے نظریات بھی ملتے ہیں-اوما کے کردار میں ہندوؤں کی شادی کی رسم میں پھیروں کا ذکر بھی ملتا ہے یہ پھیرے اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ جنم جنم کا ساتھ باقی رہے-ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انسان کا بار بار جنم ہوتا ہے اور ہر جنم میں انسان نئے روپ میں پیدا ہوتا ہے-

یہ تم لوگوں کی شادی میں پھیرے لیتے ہوئے اتنی دیر کیوں لگاتے ہیں-"راحیلہ نے پوچھا

"تاکہ جنم جنم کا بندھن ہو۔۔۔۔۔۔۔ ساتھ کبھی نہ ٹوٹے۔۔۔۔۔"

ہمارے ہاں ایک اور قسم کی شادی بھی ہوتی ہے راحیلہ ؟....

کیسی شادی۔۔۔۔۔

گندھراب وواہ۔۔۔۔۔ مرضی کی شادی۔۔۔۔۔ تم نے فلموں میں نہیں دیکھا۔۔۔۔ مندر میں

جاکر مرد اور عورت دیوتا کو گواہ کر کے شادی کر لیتے ہیں-دیوتا کے اشیر باد کے ساتھ-----
بغیر کسی گواہی کے مرد اور عورت دیوتاؤں کے سامنے میاں بیوی بن جائیں-----
راجہ وشنت نے شکنتلا سے گندھراب وواہ کیا-مہاراج اندر کے لاڈلے ارجن نے الوپی سے ایسا ہی گندھراب وواہ کیا-بھیم سین نے باسک ناگ کی راجکماری ایل متی سے ایسی ہی شادی رچائی-پھر آج کل کے لوگوں میں ایسی شادی کے خلاف اتنا زہر کیوں؟
ہمارے مذہب میں تو گندھراب وواہ کی اجازت ہے------جب پریمی اور پریمیکا کسی بت کے آگے سوگند کھا کر ایک ہو جاتے ہیں تو وواہ ہو جاتا ہے..... [۱۷]

درج بالا مکالمے میں اوما ایک مسلم لڑکی سے گندھراب وواہ کے حق میں باتیں کرتی دکھائی دیتی ہے اور یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ یہ شادی ہمارے مذہب میں جائز ہے اور خود ہندو مذہبی لوگوں نے یہ شادی کی ہے-اس شادی کے لیے کسی دنیاوی شخص کی موجودگی لازم نہیں ہوتی محض مندر میں جاکر دیوتا کی موجودگی میں یہ شادی ہو سکتی ہے-اوما کا ماننا تھا کہ شادی تو دیوتاؤں کی موجودگی میں ہو جاتی ہے تو والدین کی اجازت کی کیا ضرورت ہے-اوما بچپن میں ہی اپنے والدین سے بچھڑ جاتی ہے-اسے اس قسم کے حالات درپیش آتے ہیں جو اسے بچپن میں ہی سمجھدار بنا دیتے ہیں-حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے اس کا ماننا ہے کہ کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو ختم کر دیتی ہے-

اوما سب کے کام بھاگ بھاگ کرتی، کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتی سب کے جی حضوری کرتی-ہر شخص کی ضرورتوں کا خاص خیال رکھتی-وہ اپنے عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ ذہین اور سمجھدار تھی-اس کے اندر لیڈر کی صفات تھی-سب کے دلوں میں گھر کرنے کا ہنر اسے خوب آتا تھا-صبح سویرے جاگتی عبادت کرتی اس کے ان خصائص کی وجہ سے سب اس کو پسند کرتے اور اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے-کوئی اسے پسند نہ بھی کرتا تو وہ اسے ہولے ہولے رام کر لیتی تھی-اوما ایک فرمانبردار لڑکی تھی اپنے بڑوں کا بے حد احترام کرتی ہے اور ان کی ہر بات کو پلو سے باندھ کر رکھتی ہے-

برصغیر کے کلچر میں سینما میں جاکر فلمیں دیکھنا کلچر کا ایک اہم حصہ تھا-اس کے بزرگ جو فلم دیکھنے سے منع کرتے تھے وہ ان کی غیر موجودگی میں بھی نہیں دیکھتی تھی-دوسرے بچوں کو بھی نصیحت کرتے ہوئے ہر وقت بڑوں کا حوالہ دیتی-سب بچے اس کی باتوں پر یقین کرتے اور مانتے بھی تھے-اوما کو کہانیاں سنانے کا بہت شوق تھا-جادو کی کہانیاں اپنے ہم عمر بچوں کو سناتی کہ جادو کے زور سے ریت کے ٹیلے سونے کے بن جاتے ہیں-ہر بار بارش ہونے پر اوما کرشن مہاراج اور کنس کی کہانی شروع کر دیتی-یہ کہانی وہ اتنی بار سنا چکی تھی کہ سب بچوں کو زبانی یاد ہو چکی تھی-ہر

موقع کی مناسبت سے اوما کے پاس کوئی نہ کوئی کہانی ضرور موجود ہوتی تھی-اوما کا اس بات پر عقیدہ تھا :

پرتھوی کو ایک گائے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے-جب ایک سینگ تھک جاتا ہے تو وہ اسے دوسرے سینگ پر لڑھکا دیتی ہے-ایسے میں ساری دنیا پر بھونچال آتے ہیں-پانیوں کا مدوجزر بڑھ جاتا-پاگل خانوں کے باسی خواہ مخواہ بنکارے پر مجبور ہو جاتے ہیں- [۱۸]

ہر موقع پر اپنے مذہبی دیوی دیوتاؤں کے قصے سناتی ہے اسے کہانی سنانے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا-تاریخ کے واقعات سناتے ہوئے اوما اپنی ہندی تہذیب کی طرف داری کرتی ہے-تاریخی واقعہ بیان کرتے وقت راجہ مہاراجاؤں کا ذکر ضرور کرتی تھی- مسلم بچے ٹوکتے کہ بادشاہ سلامت کہو تو وہ کہتی بادشاہوں پر شکار کچھ جچتا نہیں اور اپنی بات پر اڑی رہتی-مہاراجاوں کی شان میں ہی قصیدے پڑھتی-راجا مہاراجاؤں کے بہادری کے قصوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی- اوما کے کردار میں ہندوؤں کی موت کی رسومات کی تفصیل ملتی ہے-ہندو شمشان بھومی میں مردے کو لے کر جاتے ہیں اس کے بعد سنکھ بجایا جاتا ہے اور پھر ارتھی کو آگ لگاتے ہیں اور اونچا اونچا رام نام ست ہے کہتے ہیں-

اوما مشرقی کلچر کا نمائندہ کردار ہے اس کردار میں ایک مشرقی لڑکی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں- بانو قدسیہ اسے ایک سگھڑ لڑکی کے روپ میں دکھاتی ہیں، سلائی کڑھائی میں طاق میز پوش بنانا، پھندنے لگانا رفو کرنا اس قدر اس کے ہاتھ میں صفائی تھی کوئی دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کپڑا رفو ہوا ہے-اوما ایک مشرقی بہن ہے اپنے بھائی کے جنگ میں جانے کا سوچ کر ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے-بھائی کو آنکھوں کا تارا سمجھتی ہے اور اپنے بھائی پر جان نچھاور کرتی ہے-مشرقی لڑکیوں کی طرح اس کے کان اور ناک بچپن میں ہی چھدوا دیئے جاتے ہیں-اس کے ناک کی کیل اس کے چہرے کا حصہ معلوم ہوتی تھی-مشرقی لوگوں کی طرح اس کا ماننا ہے کہ جب چھینک آتی ہے تو اس وقت کوئی شخص یاد کر رہا ہوتا ہے-اوما کے کردار میں برصغیر کے کھیلوں گڈے گڈی کے بیاہ کا کھیل، گھوڑا بننا، ڈاکٹر مریض، اینٹوں کے چولہے بنا کر ہنڈکلیا بنانا اور گھر گھر کھیلنا ملتے ہیں-

ہندو نسوانی کردار کرشنا جو ہر جگہ اپنی ممتا بھرے رویے کی وجہ سے گائیتری ماتا کے نام سے پکاری جاتی تھی- گائیتری ماتا نہ صرف اپنے بچوں کی ماتا تھی بلکہ پورا گھرانہ ہی اسے ماتا کہہ کر مخاطب کرتا-اس کے دیور کے بچے بھی اسے چاچی کے بجائے ماتا کہتے اور اپنی سگی ماں سے بڑھ کر پیار کرتے گائتری بھی ایک ماں کا کردار ہی نبھاتی چلی آئی تھی- بچوں کو کھانے پینے کی طرف سے کوئی تنگی نہیں تھی گائتری ان کا بہت خیال رکھتی-بچے والدین سے دوری کے باعث پریشان ہوتے انہیں گلے لگا کر دلاسے دیتی اور یہ کہہ کر بہلاتی کہ والدین لڑکیوں کے جہیز کے لئے روپیہ کمانے گئے ہیں-جہیز برصغیر کے کلچر کا ایک اہم حصہ ہے-

گائیتری ایک مثالی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مثالی بیوی کا کردار بھی بخوبی نبھاتی ہے-اپنے شوہر کا بے حد احترام کرتی تھی-ساری عمر اپنے شوہر سے اختلاف رائے نہیں کیا-اپنی ہر صبح کا آغاز شوہر کے پاؤں چھو کر کرتی تھی-ہر رات اپنے شوہر کی آرتی اتار کر سوتی-گائیتری قدیم اقدار و روایات کی حامل ایک ایسی بیوی تھی جو شوہر کی بات سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی بھی شوہر کی فرمانبردار رہتی ہے-سعادت مندی سے شوہر کی ہر بات میں ہاں میں ہاں ملاتی کبھی بھی بحث و مباحثہ اور تکرار نہیں کرتی- وہ ایک مکمل گھریلو عورت تھی گھر میں ہر وقت کھانے پکاتی رہتی گھر کے تمام افراد کی خدمت کرتی اور دوسروں کے جذبات کا بہت خیال رکھتی ہے-بیوہ نند کے جذبات مجروح نہ ہوں اس بات کو مد نظر رکھ وہ کڑواچوتھ کا تہوار بھی نہیں مناتی تھی-کرشنا ایک مذہبی عورت ہے چھوٹی سے چھوٹی حاجت کے لیے بھی بھگوانوں کے آگے بنتی کرتی ہے-

پاشی ایک ہندو بیوہ عورت کا کردار ہے-سخت طبیعت کی مالک پاشی کی ناک پر ہر وقت غصہ سوار رہتا گھر کے تمام افراد اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے-پاشی کا رویہ گھر والوں کے ساتھ اپنی بہنوں اور گھر کے ملازمین کے ساتھ بہت تلخ تھا-چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی پاشی ان کے کان مروڑتی اور تھپڑ لگانے سے بھی گریز نہیں کرتی-پاشی ہندو مذہبی نظریات کا حامل ایک کٹر ہندو کردار ہے-اپنے لباس، ملنے جلنے کے کے آداب اور عقائد میں ہندو تہذیب کی عکاسی کرتی ہے-

> پاشی بہن جی اپنے شوہر سور گباشی لالہ امی چند کے ساتھ ستی نہ ہو سکیں-اگر ستی کا زمانہ بھی ہوتا تو بھی وہ لالہ امی چند کی ارتھی میں لیٹ کر بھرشٹ ہونا پسند نہ کرتیں اور پیش از وقت اپنی کپال کریانہ کرواسکتیں------ایک دھوتی سے دوسری دھوتی کے وقفے تک وہ اپنی گردن پر چھوٹا سا جوڑا کس کر کانسی کی لٹیا اور پیتل کی بلٹوہی کے ساتھ مورتیوں کو اشنان کراتیں-سیڑھیوں پر پانی چلاتیں' باورچی خانے میں گائے کے پیشاب کے چھینٹے اڑاتیں۔[19]

پاشی کے کردار میں ستی کی رسم کا ذکر ملتا ہے-اس زمانہ تک جب پاشی بیوہ ہوتی ہے ستی کی رسم کے رواج کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے اگر یہ رسم رائج بھی ہوتی تب بھی پاشی اس رسم کے مطابق اپنے شوہر کے ساتھ ستی نہ ہوتی-وہ ایسی فطرت کی مالک عورت تھی جو کسی کے لیے اپنی زندگی خراب نہیں کرتی تھی-پاشی اپنے مذہب کے مطابق جب بڑوں سے ملتی تو جھک کر پالاگن کہہ کر ملتی-بات بات پر بھگوان کی سوگند کھاتی ظاہری حلیہ بھی اپنی تہذیب کے مطابق تھا-بھگوانوں کی مورتیوں کو دھوتی باورچی خانے کو گائے کے پیشاب سے دھوتی-پاشی کا عقیدہ تھا کہ گائے کے پیشاب سے باورچی خانہ پوتر ہو جاتا ہے-

بانو قدسیہ نے پاشی کے کردار میں بیوہ عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے-بیوہ عورت کا مزاج اتنے بڑے سانحے کے بعد تلخ ہو جاتا ہے-تنہائی کا خوف اسے ستاتا رہتا ہے یہ تنہائی دور کرنے کے لیے پاشی بیماری کا ڈھونگ رچا کر سب کو اپنے ارد گرد جمع کیے رکھتی تھی-دوسروں کی جھوٹی شکایتیں لگا کر ہمدردیاں بٹورتی رہتی-ہر وقت اداس چہرہ لئے پھرتی اپنے نصیبوں کا رونا روتی رہتی-بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنا غصہ نکالتی رہتی ہے-

پاشی کو ہر شخص کی صورت میں اپنائے مرحوم شوہر کی شکل دکھائی دیتی تھی وہ اپنے مرحوم شوہر سے شکوے بھی کرتی کہ بھری جوانی میں معمولی بیماری سے کیوں مر گیا-پاشی کو ہر وقت ہر کسی سے شکایتیں رہتیں نہ کبھی خود خوش رہتی اور نہ کبھی کسی کو خوش رہنے دیتی-اس کے خیال میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے سب اس سے باتیں چھپاتے ہیں-ہر موقع پر بھاں بھاں کر کے رونے لگتی-پاشی اپنے غم میں دوسروں کے جذبات کا خیال نہیں رکھتی-سارا گھرانہ اس کی وجہ سے نہ کوئی مذہبی تہوار منا سکتا تھا اور نہ ہی پاشی کی وجہ سے اس گھرانے نے کبھی کوئی خوشیاں منائیں -بظاہر تو پورا گھرانہ پاشی کے آگے خاموش رہتا لیکن اندر ہی اندر سب کڑھتے رہتے تھے-

> پاشی بہن جی پہلی عورت تھی جو بیوہ ہوئی۔۔۔۔۔ان کی وجہ سے نہ تو دیوالی کو ان کے گھر ٹھیک طور سے دیئے جلتے نہ بسنت کے روز کوئی بسنتی ساڑھی پہنتا-نہ ماسی کرشنا کرواچوتھ کا برت رکھ سکتیں-نہ جنم اشٹمی کے دن برہمنوں کی سیوا ہوتی-بس جب کوئی بات ہوتی بلک بلک کر رویا جاتا-رونا اگر رونا رہے تو خوب ہے لیکن اس میں اگر ہنٹر کی کیفیت پیدا ہو جائے تو باقی رستے بستے گھر والے سہم کر رہ جاتے ہیں-
>
> سارے گھر والے ایسے تھے گویا اوپر سے برف پوش چوٹیاں اور اندر دہکتا ابلتا لاوا۔۔[20]

سرسوتی اور شیل کانت ہندو لڑکیاں ہیں یہ کردار ایک کٹر ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے-دونوں لڑکیاں سفید رنگ و روپ کی مالک، خوبصورت نرم و نازک جسم والی، ہمیشہ دھیمی آواز میں بات کرتی-ان دونوں لڑکیوں کی تربیت مذہبی اصولوں کے مطابق ہوئی تھی-ان کے کردار پر کڑی نظر رکھی جاتی-ہر بات میں بھگوانوں سے ڈرایا جاتا-ہندو عقائد کے مطابق ان کو انڈہ اور ماس کھانے کی ہر گز اجازت نہیں تھی-ان دونوں کرداروں میں خدمت گزاری کا عنصر ملتا ہے-بڑوں کی ہر بات مانتی ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی-مذہبی نظریات کی حامل بھگوان کرشن کا واسطہ دے کر بات کرتی-نمستے کہہ کر ملتی، ناپسندیدہ بات کو چھپی چھپی کہہ کر بیان کرتی-ان دونوں کرداروں کے ہاں ہندوانہ عقائد کی عکاسی ہوتی ہے-

> ان لڑکیوں کی جوانی میں آنچ کی کمی تھی-انہوں نے کبھی انڈہ اور ماس نہیں کھایا تھا---بیچاری شادی کی تیاریوں میں ڈھیر ہوئی رہتیں-لیکن ابھی تک کوئی بر نہیں ملا تھا-کراس سیج کے پھول میز پوشوں پر

بنابنا کر وہ خود کراس آئیڈ ہو گئی تھیں- کروشیے کی لیسوں سے ٹرنک بھر گئے تھے لیکن ابھی تک منگنی نہ ہوئی تھی- شادی کے لئے مناسب بر ابھی تک نہ جانے کہاں تھے- رسوئی بنانا 'جھاڑو بہاوا'' ماتا جی کی آگیا کا پالن..... اتنے سارے کام---[۲۱]

ان دونوں کرداروں کی تربیت سخت ماحول میں ہوئی تھی- بڑوں کی بات سے کبھی اختلاف رائے نہیں رکھتی ان سے ڈرتی رہتی اور مشرقی لڑکیوں کو شادی سے پہلے جتنے بھی گھریلو کام سکھائے جاتے ہیں ان کو سیکھتی رہتی- سویٹر بنتی، کروشیا، سلائی کڑھائی میں طاق تھی-

سوہن سنگھ کے آباؤاجداد سکھ تھے لیکن یہ کردار اپنے آپ کو راجپوت ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا- اس کردار نے اپنا حلیہ راجپوتوں کی طرح بنا رکھا تھا- راجپوت جس طرح اپنے پورے سر پر استرا پھیر کر گردن کے قریب کچھ بال رکھتے، سوہن سنگھ کا استرا پھرا سر چمکدار صرف بودی گردن پر کچھ بال تھے- پیٹ اور سینے کے گرد اس نے ایک دھاگہ باندھ رکھا تھا یہ دھاگا جینئو کہلاتا ہے جسے عام طور پر اونچی ذات والے ہندو پہنتے ہیں- سوہن سنگھ اس دھاگے کی نمائش کرتا سخت سردی اور شدید گرمیوں کے موسم میں بھی وہ کپڑے نہیں پہنتا تھا تاکہ اس کا یہ دھاگا کسی کپڑے کے ساتھ لگ کر خراب نہ ہو جائے- مہاراج کرشن کو بہت پسند کرتا اور انہیں کی طرح کا روپ دھار ناپسند کرتا تھا- اپنے لباس اور عقائد میں وہ کٹر ہندو ہے- اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے سوہن سنگھ پوجا پاٹ کا اہتمام کرتا تھا-

الکھ پرش کو خوش کرنے کے لئے وہ پوجا پاٹ کے علاوہ دن میں ایک راکھ دان میں کوئلے سلگا کر دھوپ سامگری اور ہرمل کی دھونی بناتا اور اوم بھور بھئے سوا ہا پڑھتا سارے کمروں میں Fumigation کرتا رہتا...... اس کا خیال تھا کہ اس طرح دھونی دینے سے نہ صرف جراثیم ہی مر جاتے ہیں بلکہ بد روحیں برے خیال اور بد شگون بھی ختم ہو جاتے ہیں۔[۲۲]

بانو قدسیہ نے سوہن سنگھ کے کردار کے ذریعے سے ہندوؤں کا ایک عقیدہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندو پورے گھر میں دھونی دیتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس طریقے سے بد روحیں آفات اور جنوں بھوتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے- سوہن سنگھ اپنے دیوتاؤں کا بے حد احترام کرتا تھا اپنی ہر صبح کا آغاز وہ مہاراج رام چندر کی خدمت میں پیش ہونے کے بعد کرتا- اپنے دیوتاؤں کا اس قدر احترام کرتا کہ دیوتاؤں کے حضور پیش ہوتے وقت اپنی آواز نیچی کر لیتا- دیوتاؤں کی آرتی اتارتا، ان کی شان میں گیت گاتے ہوئے تصویر کی طرف پیٹھ بھی نہیں کرتا اور الٹے قدموں واپس آتا-

پریم دئیی ایک مونے سکھ کی بیوی تھی .اس کے شوہر نے اپنی داڑھی اور کیس منڈھوار کھے تھے البتہ کبھی کبھی وہ اپنے بازو پر کڑا پہن لیتا تھا-پریم دئیی مذہبی نظریات کا حامل کردار ہے-اپنے بھگوانوں کو خوش کرنے کے لئے گانا بجانا سیکھتی ہے اور اپنے بچوں کو بھی گانا سیکھنے کی طرف مائل کرتی ہے-ان کے گھر ایک ماسٹر پریم دئیی اور اس کی بیٹی کرشنا کو گانا سکھانے کے لیے آتا ہے-پریم دئیی گانا سیکھنے کی طرف خاص توجہ رکھتی ہے اس کا عقیدہ ہے کہ اس کے گانے سے بھگوان خوش ہو کر اسے اور رزق دیں گے-گانا بجانا اس کے مذہب کا ایک اہم حصہ ہے-وہ کافی سالوں سے ہارمونیم پر گیت بجانا سیکھ رہی تھی لیکن عرصہ گزرنے کے باوجود اس کے سر تال درست نہیں ہوئے تھے-اس کے باوجود وہ اپنی کوشش جاری رکھتی ہے اور اپنی بیٹی کو بھی ہر وقت یہی نصیحت کرتی رہتی ہے کہ اگر تم گانا بجانا نہیں سیکھو گی تو اپنے بھگوان کو کیسے راضی کر پاؤں گی-

> آدھی آستینوں کا بلاؤز اور پورے لدے باغ کی کڑھائی والا پیٹی کوٹ پہنے وہ باہر والے چھوٹے برآمدے میں بیٹھی گھونگھرو والی پنوں سے جوڑا ٹکائے ہارمونیم کا شغل کرتی نظر آتی-ایک دن ایک مینڈک پاؤں تلے آگیا تو ساری شام وہ رو رو کر ہولے ہولے کہتی رہیں "ہائے ہائے مہا پاپ مہا پاپ----"شام کو دھوپ سامگری جلا کر انہوں نے کئی گھنٹے جب تپ بھی کیا-ویسے بھی پریم دئیی کو سندھیا کا بڑا شوق تھا-وہ ہر منگل کے روز مندر بھی جاتی اور صبح و شام آرتی اتارنے کے لئے ذاتی مندر بھی تھا- --گنیش مہاراج کا بت 'مہارانی سیتا اور رام چندر جی کی مورتیاں 'زبان نکالے کالی ماتا کا کیلنڈر اور شیو جی اور پاروتی کے چھوٹے چھوٹے بت تھے-رومال میں لپٹا ہوا ایک سنکھ بھی تھا-الماری کے نیچے تلسی کے تین گملے تھے جس کو روز پریم دئیی پرنام کرنے کے بعد پانی کے چھینٹے دیتی تھی۔[۲۳]

پریم دئیی اپنے مذہبی نظریات میں کٹڑ تھی-اس کا لباس، حلیہ اور عقائد اس کے مذہب کے عکاس ہیں-ماتھے پر سیندور لگائے رکھتی سیندور ہندو مذہب میں شادی شدہ خواتین اپنے ماتھے پر لگاتی ہیں جس سے وہ پہچانی جاتی ہیں کہ یہ شادی شدہ خواتین ہیں-ہندو مذہب میں کسی جانور کو مارنا بہت بڑا گناہ ہے-پریم دئیی غلطی سے بھی کسی جانور کو مار دیتی تو اس گناہ کے ازالے کے طور پر عبادت کرتی-اگر کوئی مینڈک بھی غلطی سے پاؤں تلے آکر مارا جاتا تو اس کو لگتا کہ اس سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے-

پر ہم دئیی عبادت کی بہت زیادہ پابندی کرتی تھی مندر بھی جاتی اور گھر میں بھی پوجا پاٹ کا پورا انتظام کر رکھا تھا-گھر میں اپنے بھگوانوں کے تمام بت رکھے تھے جب بھی کوئی مراد پوری کروانی ہوتی وہ ان بھگوانوں کے آگے جا کر بنتی کرتی اور اپنی مرادیں پوری کرواتی-پریم دئیی کا ماننا تھا کہ اس کے گھر کی ساری خوشحالی اس کی انہیں عبادات کی

وجہ سے ہے- بھگوانوں کو خوش کرنے کے لئے بھجن گاتی رہتی-اس کے بھجن گانے کی آواز آس پڑوس میں دور دور تک سنی جاتی-اتنے عرصے کی ریاضت کے باوجود پریم دئیی بھجن گانا نہیں سیکھی تھی پھر بھی اس نے یہ کوشش ترک نہیں کی اور چیخ چیخ کر گاتی رہتی-

درشن سکھ معاشرت کی چلتی پھرتی تصویر ہے-دراز قد، سچی، خاموش طبع صحت مند درشن کا تعلق ایک ایسے سوڈھی سکھ خاندان سے تھا جہاں مرد عورتیں کھیتوں میں سخت مشقت کرتے-اپنی مٹی سے محبت کرتے تھے- مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل نہیں تھی-مرد عورت سب کام مل جل کر کرتے تھے-عورتیں بچوں کو تازہ سبزیاں اور دودھ سے بنی چیزیں کھلاتی درشن بھی یہی غذا کھا کر پروان چڑھی تھی اسی لیے صحت مند جسم کی مالک تھی-

سکھ معاشرت میں ہر بات میں جی لفظ کا استعمال کرتے ہیں-درشن جب بھی کوئی بات کرتی اپنی معاشرت کے مطابق جی کا صیغہ ضرور استعمال کرتی- سوڈھی سکھوں کی طرح ہر بات میں واھگرو کا شکر ادا کرتی-اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے درشن کے بزرگوں میں سیس کٹوانے کا رواج نہیں تھا-مذہب کی خاطر اس کے خاندان نے کئی قربانیاں دیں تھیں-اس کے والد نے اپنے لوگوں کے لیے اپنی ساری زمین وقف کر دی تھی-درشن صاف دل کے مالک لڑکی تھی اس کا لہجہ تو کھردرا ہوتا تھا لیکن بات صاف ستھری اور طنز سے پاک کرتی تھی اس کے لہجے میں دیہاتی پن تھا

وہ جو اس شام ملنے آئے تھے وہ---ہاں شاہد----
کتنے سوہنے ہیں---- تمہیں بھی لگے ؟.....
راحیلہ نے قدرے گلابی ہو کر پوچھا-کیا لگتے ہیں تمہارے ؟
راحیلہ نے ابھی پاؤں پر جھوٹ بولنا نہ سیکھا تھا گھبرا گئی-
تمہیں شاہد جی سے بہت محبت ہے-----
توبہ توبہ----راحیلہ بغلیں جھانکنے لگی-تم بتانا نہیں چاہتیں-
راحیلہ نے کلائی میں پڑے موتیا کے گجرے سے پھول توڑتے ہوئے کہا---لو کوئی بتانے والی بات بھی ہو-
تم بہت چاہتی ہو اسے-----واہگرو کی سوگند سچ بتاؤ ناں ؟ [۲۴]

درشن کھدر کا لباس پہنتی پنجابی جوتی اور کھدر کی چادر اوڑھتی-اپنے کلچر کا دفاع کرتی اور پنجابی زبان سے محبت کرتی-اس کا ماننا تھا کہ پنجاب کے رہنے والوں کو صرف پنجابی ہی بولنی چاہئے اور پنجابی بول کر اپنی زبان کو مضبوطی

عطا کرنی چاہیے-اس کے پنجابی لہجے کا مذاق بنایا جاتا درشن مشنری کالج میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئی تھی-اس کالج میں مختلف مذاہب کی لڑکیاں انگریزی تہذیب و ثقافت سیکھنے آئی تھی-درشن کسی کا اثر قبول نہیں کرتی تھی وہ اپنے کلچر پر نازاں تھی-لڑکیاں درشن کا اس کے کلچر کی وجہ سے مذاق اڑاتی تھیں-طنز کے تیر برساتی لیکن درشن کسی سے دبنے والی نہیں تھی وہ سب کی باتوں کا منہ توڑ جواب دیتی-اس کے لباس، زبان، رہن سہن، کھانے پینے پر ٹونٹ کی جاتی درشن دلبرداشتہ ہونے کے بجائے اس کے والد جب بھی اس سے ملنے ہوسٹل آتے، گنے، اچار ساگ اور مکھن لے کر آتے درشن اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر دعوت اڑاتی-

درشن ایک شاندار شخصیت کی مالک لڑکی تھی وہ ایک ایسے سکھ سردار کی بیٹی تھی جس نے اپنی زندگی آدرشوں کے مطابق بسر کی تھی-درشن بھی اپنے والد ہی کا پرتو تھی-اپنے کلچر سے پیار کرتی اور دوسری تہذیبوں کو اپنے آگے کچھ نہ سمجھتی تھی-درشن کے کردار میں سکھ کلچر کے نظریات ملتے ہیں کہ ایک سکھ سوا لاکھ آدمیوں کے برابر ہے-مرد سکھ کلچر میں جابر بن کر عورت پر حکومت نہیں کرتا نہ ہی یہ قوم دلوں میں نفرت رکھتی ہے یہ صاف نیت والی قوم ہے منہ پر ہر بات کرتی ہے دلوں میں بغض نہیں رکھتے اور نہ ہی مذہبی تعصب رکھتے ہیں-ہر خوشی غم کے موقع پر واہ گرو کو یاد کرتے ہیں- مصیبت کے موقع پر ہائے واہگرو کہہ کر اور خوشی کے موقع پر واہگرو کا شکر ادا کرتے نظر آتے ہیں-درشن کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے مذہب اور کلچر کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی رسومات کی پابندی کرتے ہیں-

ناول کا عیسائی کردار ایک امریکن عورت کا کردار ہے جو مشنری کالج کی پرنسپل ہے-لمبی چوڑی، چھ فٹ قد کی مالک، باوقار شخصیت اور مقدس صورت کا مالک یہ عیسائی کردار اپنے لباس، عقائد اور نظریات میں عیسائی مذہب کا ترجمان ہے-یہ امریکن خاتون اپنی ہر صبح کا آغاز یسوع مسیح سے دعا کے بعد کرتی ہے عیسائیوں کے عقائد کے مطابق اس کردار کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ تمام انسان گنہگار پیدا ہوئے ہیں اور یسوع مسیح حضرت عیسیٰ انسانوں کے گناہ دھونے کا ذریعہ ہیں-عیسائی مذہب کے تمام عقائد اس کردار میں بدرجہ اتم موجود ہیں-حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتی ہے اور اس میں رتی برابر بھی شک نہیں کرتی-مصیبت کے وقت حضرت یسوع مسیح سے لمبی لمبی دعائیں مانگتی اور حضرت مسیح کے نام خدا حافظ کہتی-سفید لباس پہنے، سفید ہی جوتے ہاتھوں میں بائبل لیے اس کردار کا حلیہ، عقائد و نظریات عیسائی کلچر کے بہترین عکاس ہیں-

پرنسپل قریب آئی تو تمام لڑکیاں سکول گرلز کی طرح کھڑی ہو گئیں-

گڈ آفٹر نون۔۔۔۔۔سب بیک وقت بولیں-

گڈ آفٹر نون گرلز۔۔۔Studying؟.....

سب مسکرانے لگیں۔

.....Enjoying the sun

یس۔۔۔ مس۔۔۔ارملہ کپور سب کی جانب سے بولی۔

....Nice weather [۲۵]

امریکن عیسائی عورت کا کالج کی پرنسپل ہونے کی حیثیت سے کالج کی لڑکیوں پر بہت رعب و دبدبہ تھا۔سب اس کے آنے پر خاموش ہو جاتیں۔اس کی شخصیت بہت پر اثر تھی اور سفید بال ہونے کی وجہ سے بھی اس کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔اس کلچر میں بڑی بوڑھیوں کا بڑا لحاظ کیا جاتا ہے اور ان کے آنے پر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے۔

دیو بدھ مذہب کا ایک کردار ہے۔اس کردار میں بدھ مذہب کے نظریات کی عکاسی ملتی ہے۔بدھ مذہب میں جب لڑکا گیارہ بارہ برس کا ہو جاتا ہے اس کو لاما بنانے کی غرض سے بھیج دیا جاتا ہے۔دیو بھی ایک ایسا ہی کردار ہے امیر خاندان کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود اپنے کلچر کے مطابق اس کے والدین اسے گیارہ برس کا ہوتے ہی چند ضرورت کی اشیا تھما کر لاما بنانے کے لیے روانہ کر دیتے ہیں۔بدھ مذہب کی عبادت گاہ میں جہاں لاما رہتے ہیں وہاں ان بچوں کو پہلے کڑے امتحان سے گزارا جاتا ہے کہ وہ لاما بننے کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔

> میں ساری رات چلتا چلتا۔۔۔۔ صبح عبادت گاہ پہنچا۔وہاں ہزاروں لاما رہتے ہیں۔۔بڑی دیر میں عبادت گاہ کے دروازے پر بیٹھا رہا۔بڑی سردی تھی۔ایک بوڑھا لاما باہر نکلا۔اس کے سر پر استرا پھرا ہوا تھا۔۔۔سنو دیوا اگر رات تک بغیر ہلے جلے مہاتما بدھ کی طرح بیٹھو گے تو ہم تمہیں اندر لے جائیں گے اور لاما بنائیں گے۔۔۔۔بدھ کی طرح بیٹھ گیا۔۔۔۔۔۔میں دوپہر تک ویسے ہی بیٹھا رہا لیکن میرے پیروں میں سوئیاں چبھنے لگیں۔یوں لگتا تھا جیسے ٹانگیں لکڑیاں بن گئی تھیں۔بھوک پیاس کی وجہ سے عجیب عجیب رنگ نظر آنے لگے۔پتا نہیں.... میں کب سو گیا. جب شام کو سورج ڈوبا تو بوڑھا لاما باہر نکلا۔میں ریت کے ڈھیر پر سو رہا تھا جی۔ میرے ہی سونٹے سے مجھے چھچھ کار کر بولا۔۔۔۔۔دیو جاؤ کوئی بیوپار کرو۔۔۔۔کھیتی باڑی کرو۔۔۔۔۔لاما بننا تمہارے بس کی بات نہیں۔میں واپس نہیں جا سکتا تھا.....میرا باپ مجھے جان سے مار دیتا۔.....میں بھٹکہ تا پھرتا تھا پہاڑوں میں.... [۲۶]

دس گیارہ برس کا بچہ اتنے سخت امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔دیو بھی جب اس امتحان میں کامیاب نہیں ہوتا تو بجائے اپنے گھر واپس جانے کے وہ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا مختلف شہروں میں روزی روٹی کے لیے دھکے کھاتا سخت محنت مشقت کرتا ہے۔سامان ڈھوتا ہے لیکن اپنے باپ کے ڈر سے گھر واپس نہیں جاتا۔بدھ مذہب میں مذہبی

والدین پر اپنے بچوں کو لاما بنانے کا اس قدر جنون سوار ہو جاتا ہے کہ اگر بچہ لامانہ بن سکے اور گھر واپس آ جائے تو والدین اس بچے کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں-دیو بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جو امیر تبتی والدین کی اولاد ہونے کے باوجود بھاری بوریاں اٹھا کر لاری اڈے پر سخت سے سخت محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا ہے لیکن والدین کے ڈر سے گھر واپس نہیں جاتا-

بانو قدسیہ نے دیو کے کردار میں بدھ مذہب کے عقائد کو بھی بیان کیا ہے-بدھ مذہب کی عبادت گاہوں میں عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی-لاما کا بدھ مذہب میں بے حد احترام کیا جاتا ہے-دیو بھی بوڑھے لاما کے آگے زمین پر اپنا سر جھکاتا ہے بہت عاجزی اور احترام کے ساتھ بات کرتا ہے-مذہبی پیشوا مہاتما بدھ کا ذکر بھی بانو قدسیہ کرتی ہیں-مذہبی لوگ ان کی تعلیمات پر چلتے ہیں-انہوں نے دنیا کو ترک کر کے عبادت کی تھی-مذہبی لوگ ان کی ہی پیروی میں تمام دنیاوی کاموں کو ترک کر کے صرف عبادت کرتے ہیں-

زبان احساسات جذبات اور خیالات کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے-بانو قدسیہ نے کرداروں سے جو زبان ادا کروائی ہے وہ ان کے تہذیبی و ثقافتی رویوں کی ترجمان ہے-ناول میں کردار جس خطے، طبقے مذہب اور شعبے سے تعلق رکھتا ہے اس کا اظہار اس کردار کی زبانی ہو جاتا ہے-

فتح خان کا کردار ایک چوکیدار کا کردار ہے اس کردار کا تعلق جہلم سے ہے-یہ کردار اپنے حلیے، زبان اور اپنے نام سے اپنے خطے کی نمائندگی کر رہا ہے-فتح خان ایک پٹھان ہے ہر وقت نیلی آنکھوں میں سرمہ ڈالے رکھتا اور لمبے سفید بالوں میں مہندی لگائے رکھتا-دوسری جنگ عظیم میں حوالدار تھا جنگ میں ٹانگ میں نقص آ جانے کی وجہ سے وہ فوج کی نوکری چھوڑ کر چوکیدار کی نوکری کرنا شروع کر دیتا ہے-اس کے اندر تمام سپاہیانہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں-آواز میں گھن گرج اور ہر وقت چوکنا رہتا ہے-اس کی زبان اس کے خطے کی عکاسی کرتی ہے-

فتح خان--فتح خان

جی صاب آیا او تم فکر نہ کرو صاحب جی'ام ادھر ہے---کسی پدر سوختہ کا مجال نہیں جو قدم اندر رکھے---

ابھی اس جالی والے دروازے کے پیچھے کوئی تھا---

تم فکر نئیں کرو---ام ابھی دیکھتا ہے---

صاب ادھر تو کچھ نہیں---ام نے سارا دیکھا ہے-

میرا خیال ہے چھت پر---وہاں کوئی نہ ہو---

او تم ایدھر ٹھہرو'ام ابھی دیکھت

اوپر کا تینوں کمرہ سنسان پڑا ہے صاب۔۔

شاید میرا وہم ہو گا

واہم۔۔۔ ہو سکتا ہے لیکن سر آپ سیف ضرور دیکھ لے۔۔۔۔ یہ جو ریفوجی ادھر آرہا ہے 'وہ بڑا چور ہے.... کوٹھیاں لوٹتا ہے.... تالے توڑاے.... پتا نہیں کدھر کا خلقت آرہا ہے خدا خبر..... سب چور اچکا پدر سوختہ چلا آرہا ہے.... سب نعرہ لگاتا ہے پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔ سب سوچتا کدھر ہاتھ مارے 'کس کو لوٹے"

اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔

بتیاں بجھادے ام؟ [۲۷]

درج بالا مکالمے میں بانو قدسیہ نے اس کردار کی حرکات و سکنات اور پس منظر کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چوکیدار عموماً پٹھان ہوتے ہیں ناول کا یہ کردار بھی ایک پٹھان چوکیدار ہے جو اپنی زبان سے اپنے خطے کی نمائندگی کر رہا ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول میں مالی کے کردار کو تخلیق کرتے وقت اس کے ماحول کو بھی مد نظر رکھا ہے۔مالی کے کردار کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے مصنفہ بہت عمدہ منظر نگاری کرتی ہیں۔ قمیض اتارے پسینے سے نچڑا بدن لئے مالی گھاس کاٹتا ہے کام کے دوران اگر اسے کوئی مخاطب کرتا ہے تو سورج کی گرمی کی تپش اس کے لہجے میں بھی در آتی ہے۔ اپنے کام میں مصروف مالی کو جب اپنا کام چھوڑ کر کسی کو جواب دینا پڑتا ہے تو وہ کرخت لہجے میں اس کا جواب دیتا ہے۔ناول میں سے مکالمہ ملاحظہ کیجئے:

اس کے نظر راحیلہ پر پڑی تو اس نے مشین وہی چھوڑ دیں اور اس کی جانب بڑھا۔۔۔

آتے ہی گرجا۔۔۔۔ادھر کیا کرت ہے چھوری؟....

کلرک سے ملنا ہے دو ایک ایڈریس لینے ہیں"

جاری اٹھو۔۔۔۔۔ کلرک کو ملت رہی۔۔۔۔۔۔ وہ تیرا کون ہوت ری۔۔۔۔۔ابھی یہاں سے چیج وستو لے کر بھاگ رہے بھانت بھانت کے لوگ آتے رہے ایہاں۔۔۔۔۔ کسی کا کیا اعتبار۔۔۔۔ چل نکل۔۔۔۔۔مالی نے اسے دھکا دیا۔۔۔۔

چھٹی ہوئے رہی کالج ماں۔۔۔۔ چلتی ہو"

مالی جی وارڈن صاحبہ کہاں ہیں؟

نوکری چاکری یہاں ہے ہی نہیں تو کیا مانگت ہے چھوری۔۔۔ [۲۸]

مالی کا یہ کردار گو مثالی خصوصیات کا حامل کردار نہیں ہے لیکن بانو قدسیہ اس کردار سے اس کے مقام و مرتبے کے عین مطابق گفتگو کرواتی ہیں-مالی ناخواندہ ہونے کی وجہ سے اپنی مادری زبان میں ہی بات کرتا ہے-اخلاق سے عاری یہ کردار مخاطب کرنے والے کا عندیہ سمجھے بغیر بد تمیزی سے بات کرتا ہے مبالغہ آرائی کرتا اور دھکے دے کر اسے وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا ہے-یہ کردار اپنی کلاس کی بھرپور نمائندگی کر رہا ہے-

ناول میں بانو قدسیہ نے پولیس کے شعبے کے ایک سپاہی کے کردار کو تخلیق کیا ہے-سپاہی پولیس کے شعبے میں ہونے کی وجہ سے خود کو بہت طاقتور سمجھتے ہیں-ہر وقت اکڑے ہوئے رہتے ہیں اور ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں-ہر وقت لوگوں کو جانچتے پرکھتے رہنا اور ان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنا کہ اس شخص نے کوئی نہ کوئی جرم ضرور کر رکھا ہو گا-گالی گلوچ دینا اور ناشائستہ زبان کا استعمال کرنا ان لوگوں کی عادت ہوتی ہے-ایسے ہی ایک سپاہی کا مکالمہ درج ذیل ہے:

کیا کام ہے سالے----

مجھے تھانے دار صاحب سے ملنا ہے----پلیز-

تیرا ان کا کیا رشتہ ہے 'تیری بہن کا یار ہے تھانے دار---؟

جی ایک ذاتی کام ہے-----میں ایس ایچ او صاحب سے ہی ملوں گا"

بلا وجہ سپاہی نے نووارد کو گریبان سے پکڑ کر دو چار دھکے دیئے-

اوئے کنجرا! سارے تیرے ذاتی کام نکال دوں گا-بول کدھر ڈکیتی کی ہے 'کون سا گھر لوٹا------

-ایک بار جو تھانے میں قدم رکھے آگے اس کا کھرا ناپ لینا چاہیے-

سپاہی لیاقت نے اس کی کمر میں دھموکا مار کر اسے کھڑا کر دیا----

ہم تھانے والے پورا پورا علم رکھتے ہیں سرکار--کوٹھے پنڈ میں اس کا گھر ہے---ہم سے کیا چھپے گا

سرکار بد معاش ہے سر بد معاش----[29]

بانو قدسیہ کی مکالمہ نگاری میں سلاست اور روانی پائی جاتی ہے-وہ اپنے کرداروں سے بڑے برجستہ اور کھلے ڈھلے انداز میں مکالمے ادا کرواتی ہیں-عشرت رحمانی بانو قدسیہ کی مکالمہ نگاری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> بانو قدسیہ کی مکالمہ نویسی میں زبان کی گھلاوٹ اور بیان کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے—کہیں کہیں جوا شارے، کنائے، تشبیہات و استعارات بھی استعمال کیے گئے ہیں، جو اکثر مواقع پر برجستہ اور دلکش ہیں-[30]

بانو قدسیہ نے اس مکالمے میں پولیس کے سپاہی کا جو رویہ بیان کیا ہے وہ حقیقت سے قریب تر ہے۔ پولیس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد ایسی ہی ناشائستہ زبان کا استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بات بات پر گالم گلوچ ان کی سرشت میں شامل ہے۔

بانو قدسیہ نے سید اکرام شاہ کا کردار جاگیردار طبقے کا عکاس تخلیق کیا ہے۔ اس کردار کا نام، لباس، بول چال کا انداز، رہن سہن اور معاملات زندگی اس کے طبقے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

> شاہ صاحب بڑی گھیر دار لنگی تہمد باندھتے تھے۔ پیروں میں ان کا کھسا باریک تلے کی کڑھائی سے ڈھکا ہوتا۔ کھلی کلیوں والی قمیض کی جیبوں میں کئی ہزاروں کے نوٹ ہوتے۔ وہ اہل بیت کی ہر بات پر سر دھنتے پنجتن پاک کی قسمیں کھاتے اور سعدی اور حافظ کے شعر بے تکان پڑھتے تھے۔ سید صاحب کی شخصیت کسی مزار کے غلاف کی طرح بڑی پرکشش، مڑھی اور کڑھی ہوئی اور سبزہ سبز تھی۔ [۱۳]

جھنگ سے تعلق رکھنے والا یہ کردار اپنی مقامی زبان میں بات چیت کرتا ہے۔ سرائیکی زبان بولتا ہے اس کا لہجہ بہت مٹھاس بھرا ہوتا ہے۔ اپنے دوست احباب کو ہمیشہ سائیں اور سرکار کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ شعر و شاعری کا بڑا شغف رکھتا ہے۔ خود بھی نامور شاعروں کے شعر بے تکان پڑتا ہے اور ملک کے جانے مانے شعراء کو بھی اپنی محفلوں میں مدعو کرتا ہے۔ اہل فن کا قدردان ہے ان کے آگے بچھا جاتا ہے۔

جاگیردارانہ طبقے کے مطابق اس کا رہن سہن ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے شہر میں کئی کوٹھیوں کا مالک ہونے کے باوجود اپنے آبائی گھر میں رہائش پذیر ہے۔ سید اکرم شاہ روپے پیسے کو پانی کی طرح بہاتا ہے۔ اپنے طبقے کے عین مطابق نمود و نمائش کا شوقین ہے۔ گھوڑوں کی نمائش کروانا، شکار کرنا، قوالی کی محفلوں کا اہتمام کروانا، شہر کی اعلیٰ قسم کی طوائفوں کو گھر لا کر رکھتا ہے اور علاقے کے افسروں کو رشوت دیتا ہے۔ سب ہی اس کی دولت کی وجہ سے اس کی بات کو حق سمجھتے ہیں۔ اپنے علاقے میں اسی کا راج چلتا ہے۔ کئی مزارعے ہر وقت حاضر خدمت رہتے۔ ڈپٹی کمشنر اور سیاست سے تعلق رکھنے والے اور ملک کے بااثر لوگوں سے تعلقات استوار کیے ہوئے ہے۔ اپنے ساتھی جاگیرداروں کے سامنے ان کی تعریف کرتا ہے اور پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں کرتا ہے۔

> تساں اپنے کوں ایڈا پریشان نہ کیتا کرو۔ ایہہ غلام مشتاق جھیڑا اپنا دوست اے چنگا آدمی نہیں..... اس دا پیو جیون ہانے پنڈ وچوں اک مسلن نسا کے لیایا اے تے ایہہ ------ ایس غلام مشتاق دیاں رگاں وچ مسلن دا لہو اے بادشاہو۔ نیچاں وچ بہہ کے اید ھا دل ٹھکانے آوندا اے ------ سرکاری افسراں نو رشوت ایہہ غلام مشتاق پہنچاوے۔ تے ڈاہڈی وڈھی کھاوے۔ ترے زنانیاں کر ئی بیٹھا ہے اللہ دے فضل نال۔ لوکاں اگے شراب نہ پیندا پر بے تکلفاں وچ بہہ کے کیسے ہور نوں پین نہ دیندا

اے۔۔۔۔۔۔۔او بادشاہو اسی سارے گناہگار آں۔۔۔۔۔۔ کی بچھدے او اساڈیاں گلاں اللہ دی رحمت ساکو معاف کر سی آپے۔ [۳۲]

درج بالا اقتباس میں بانو قدسیہ جاگیر دارانہ طبقے کے تمام افراد کے معاملات زندگی، عادات و خصائل اور معاشرتی برائیوں کو بیان کر رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس اقتباس میں سید اکرام شاہ کی مقامی زبان کی بھی عکاسی ہو رہی ہے۔

بختیار ایک اینگلو انڈین کردار ہے یہ کردار اپنی نشست و برخاست، لباس، رہن سہن، زبان پر انگریزی تہذیب کے اثرات لیے ہوئے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے یہ ایک جنرل ہے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں اس کردار نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور اس بات پر بہت نازاں ہے۔ ملٹری سے تعلق رکھنے والا جنرل بختیار خود کو سیلف میڈ کہتا ہے۔

اتنے سال میں نے Staffs college میں بسر کیے۔ Pakistan should be proud of me میرا باپ معمولی صوبیدار میجر تھا۔ ہم لوگ اتنے امیر نہیں تھے لیکن میرے باپ نے مجھے سینڈ ہرسٹ میں تعلیم دلوائی۔ میں نے Slow but sure ترقی کی ہے۔ پشاور میں چرچل کی تصویر کے ساتھ میری تصویر ٹنگی ہے۔ پاکستانی کبھی قبائلیوں کو میرے بغیر زیر دام لا ہی نہیں سکتے تھے۔۔۔ آج یہ پانچ کوٹھیوں کے مالک ہیں۔ دو باغ میں نے ملتان میں لگوائے ہیں۔ بارہ مربعے میں نے بارڈر پر آباد کیے ہیں۔۔۔ اپنی چھڑی کو سامنے والی تپائی پر مار کر جنرل صاحب نے آہستہ سے کہا" کون پیدا ہوا ہے سندھی' بلوچی' بنگالی' پنجابی جو ملٹری Authority کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ ہم Country کی Backbone ہیں۔ ہم نہ ہوتے تو ء۱۹۶۵ میں پاکستان بھارت کے پیروں تلے کچلا جاتا۔۔۔ میں خود کیا کھاتا ہوں ایک گلاس نیبو پانی صبح' بریک فاسٹ پر دو ہاف بوائل انڈے اور ایک بلیک کافی۔ دو پہر کو ایک سٹیک اور ایک پلیٹ ابلی سبزیاں۔ ایک کپ چائے فائیو او کلاک' ایک جنجر بسکٹ رات کو۔ [۳۳]

جنرل بختیار کی زبان پر انگریزی تہذیب کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ زبان انسانی تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے۔ جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کا غرور اس کردار میں نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں چھڑی' کھانا پینا' رہن سہن' جائیداد اس کے شعبے اور مقام و مرتبے کے مطابق ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول میں ایک کردار طوائف کا بھی تخلیق کیا ہے۔ رخشندہ طوائف کو بانو قدسیہ نے رشو جان کا نام دیا ہے۔ اپنے نام کے اعتبار سے بھی اور اپنی عادات واطوار سے بھی یہ کردار طوائف کے طبقے کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ایک ایسی لنگری میں ملبوس نشست فرما تھی جو عموماً مغربی فلموں کی ہیروئن باکس آفس کے نسخوں کے تحت پہنا کرتی ہیں۔اس نائیلون کی لمبی عبانما بغیر آستینوں کی کھلے گریبان والی فراک میں اس کا جسم یوں نظر آرہا تھا جیسے پانی کے بہتے جھرنے کے پیچھے کوئی آڑو کے پھولوں سے لدی شاخ ہلا رہا ہو۔ [۳۴]

رشو جان کا پروفیشن ایسا ہے جس میں جواں سال اور خوبصورت لڑکیوں کو ہی پسند کیا جاتا ہے۔رشو بھی خود کو جواں سال رکھنے کے لئے نت نئی ترکیبیں آزماتی۔جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے لوشن لگاتی، نقلی پلکیں لگائے مردوں سے بڑی دل ربائی سے بات چیت کرتی۔دوران گفتگو ادب آداب کا لحاظ رکھتی اور طوائفوں کا مخصوص انداز گفتگو استعمال کرتی ہے۔

رخشندہ نے نقلی پلکوں والی نگاہیں اٹھا کر ایک بار ظفر کی طرف دیکھا۔۔۔۔

کون مشتاق ہے ہم سے باتیں کرنے کا؟ رخشندہ نے دلربائی سے پوچھا۔

کیسے مزاج ہیں جناب کے؟ [۳۵]

بانو قدسیہ کی کردار نگاری کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جس طبقے کا کردار تخلیق کر رہی ہوتی ہیں اس کردار کی زبان بھی اس کے طبقے کے عین مطابق ہوتی ہے۔کردار اپنے طبقے کی مناسبت سے ہی بولتا دکھائی دیتا ہے۔رشو جان کی زبان بانو قدسیہ کے گہرے مشاہدے کا ثبوت ہے۔کرداروں کی اپنے طبقے کی مناسبت سے بولی جانے والی زبان کی وجہ سے ناول زندگی سے قریب تر اور معاشرے کا عکاس لگتا ہے۔بانو قدسیہ کے کردار اچھائی اور برائی ہر قسم کے خصائص رکھتے ہیں۔رخشندہ بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔بانو قدسیہ نے رشو جان کے کردار کو ایک مثالی خصوصیات کا حامل کردار نہیں تخلیق کیا۔ ڈاکٹر انور سدید بانو قدسیہ کی کردار نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

ان کی کردار نگاری میں ان کا مشاہدہ نمایاں ہے۔ان کے کرداروں میں سبھی کردار انسانی زندگی کی روانی کی طرح تمام تر نیک و بد خواہشات، آرزوؤں اور تشنگی کے ساتھ آتے ہیں۔ [۳۶]

رشو جان بھی ایک ایسا ہی کردار ہے، اچھی بری تمام خصوصیات کا حامل یہ کردار بانو قدسیہ کے وسیع مشاہدے کی دلیل ہے۔عمدہ لباس زیب تن کیے، بالوں کے نت نئے سٹائل بناتی، ابرو بنے ہوئے، چہرے کو شاداب رکھنے کے لیے کریمیں لگاتی، چہرے کے روئیں براؤن کرتی، خوشبو کا استعمال مرد کی خواہشات کو اجاگر کرنے کے لئے فراوانی سے کرتی، میک اپ زدہ چہرے سے مردوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی۔رشو جان نے مرد کو متوجہ کرنے کے لیے تمام حربوں کا استعمال کر رکھا تھا۔ہر وقت نک سک تیار مردوں کو اپنے دام میں پھنساتی نظر

آتی ہے-اس طبقے کا روزگار انہی چیزوں سے وابستہ ہے-رشو جان باقاعدہ کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف نہیں تھی جدھر اپنا گاہک نظر آتا ادھر ہی چل پڑتی ہے-اس کا اٹھنا بیٹھنا ملک کی نامور شخصیات، بیوروکریٹ اور بڑے بڑے جاگیرداروں کے ساتھ تھا-کوئی بھی محفل رشو کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی وہ ہر محفل کی جان تھی-

رخشندہ کے کئی عاشق اور قدردان تھے-بہت سے لوگ اس سے شادی کے خواہشمند تھے-رخشندہ ان کی شادی کی پیش کش کو ہر بار ہنس کر ٹال دیتی کیونکہ اس کے پروفیشن میں شادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی-جس طبقے میں رشو اٹھتی بیٹھتی تھی وہ ایک ثروت مند طبقہ تھا-ان کے ساتھ رہتے ہوئے رخشندہ خود کو بھی ایسی ہی شخصیت سمجھنے لگی تھی-امیر مردوں کی منظور نظر ہوتے ہوئے وہ ان شخصیات کے توسط سے نت نئے موقع کی تلاش میں رہتی جس میں اسے دوسرے شہروں میں جا کر اپنے پروفیشن کے مطابق زیادہ سے زیادہ لوگوں سے میل جول بڑھا سکے-

رخشندہ طوائف جب کسی نواب کی سنگت میں ہوتی خوب ناز و انداز دکھاتی اور اپنے ناز نخرے اٹھواتی-عیاش طبیعت کی مالک ہے رشو اپنے سارے پیسے تاش میں لٹا دیتی ہے-اپنے گاہکوں کو کسی دوسری طوائف کے ساتھ دیکھ کر رقابت کا شکار ہوتی ہے-رشو جان توہم پرست ہے نجومیوں کی باتوں پر یقین رکھتی ہے-اس کا خیال ہے کہ جب بھی وہ ہیرے کی انگوٹھی پہنتی ہے ضرور کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ درپیش آتا ہے-

شاہنی کا کردار ایک دیہاتی عورت کا کردار ہے-شاہنی اپنی مقامی زبان میں بات چیت کرتی ہے جھنگ کے نواح میں رہنے والی یہ دیہاتی عورت سرائیکی زبان میں بادشاہو کہہ کر مخاطب کرتی ہے-دیہات میں رہنے والی ایک پکے رنگ کی عورت دیہاتی عورتوں کی طرح شہر سے سے لائی گئی سکن آئٹمز کی شوقین ہے-اس کا جسم چربیلا ہے ہنستی ہے تو اس کا جسم بھی ہلکورے کھاتا ہے-دیہاتی عورتوں کی طرح دوپٹے کے پلو سے پیسے باندھے رکھتی-

شاہنی ایک جاگیردار کی بیوی ہے اپنے شوہر کی عیاش طبیعت سے بخوبی واقف ہے-اس کا شوہر اس طبقے کے عیاش مردوں کی طرح گھر لا کر طوائفوں کو رکھتا ہے-شاہنی ان عورتوں سے حسد کرنے کے بجائے ان سے بہنوں جیسا سلوک کرتی ہے اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی-اس طبقے کی عورتیں اپنے ماحول اور حیثیت سے بخوبی واقف ہوتی ہیں-مردوں کو کھلم کھلا عورتوں سے تعلقات رکھنے کی اجازت ہوتی ہے-بیوی اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت کی تحویل میں دیکھ کر واویلا نہیں کرتی کیونکہ اسے یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا-شاہنی کا شمار بھی انہی عورتوں میں ہوتا ہے وہ اپنے ماحول سے بخوبی واقف ہے-اس کی تربیت بھی انہیں اصولوں پر ہوتی ہے کہ یہ عورتیں تو محض دل لگی کا سامان ہیں اور اپنے شوہر کو آرام پہنچانا اس کا فرض ہے-شاہنی کا لباس، بول چال، عادات اس کے ماحول اور طبقے کے بہترین ترجمان ہیں-

سید اکرم شاہ کی بیوی جسے سب شاہنی کہتے تھے اور جس کا جسم حبشی حلوے جیسا چربیلا اور لچکیلا تھا'اندر آئی-شاہنی کا رنگ تانبے کی طرح تھا-کانوں میں بڑی بڑی سونے کی بالیاں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے ہیرے اور موتی بات کرنے پر پھڑکنے لگتے تھے-وہ قد میں سید اکرم شاہ سے دو ایک انچ لمبی تھی-سرخ تہد اور ململ کا تین گز ادوپٹہ اوڑھے وہ کسی شاندار عمارت کی طرح نظر آرہی تھی-[۷۲]

بانو قدسیہ نے شاہنی کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ اس کے مقام و مرتبے کے عین مطابق ہے-جاگیر دار کی بیوی ہونے کی وجہ سے وہ سونے کے زیورات پہنے لباس بھی گاؤں کے ماحول اور طبقے کے مطابق پہنے، دراز قد، موٹا چربیلا جسم اور سیاہ رنگ وروپ کی مالک ایک مضبوط جسم کی عورت تھی-شاہنی اپنے طبقے کے لوگوں کے مزاج کے مطابق مزارعوں کو ڈانٹتی ڈپٹتی، گالیاں دیتی اور ان سے خدمت کرواتی نظر آتی ہے-سیاہ جلد کی مالک شاہنی اپنی خوبصورت ملازمہ سے بھی حسد نہیں کرتی اس کو اپنے شوہر کی خدمت کے لیے بھیجتی ہے-

جاگیر دار طبقے اور دیہات کی عورتوں کی طرح اس کا ماننا ہے کہ جو مقام و مرتبہ ایک جاگیر دار کی بیوی کو حاصل ہے وہ کسی دوسری عورت کو حاصل نہیں ہو سکتا-اپنے شوہر کے آرام اور آسائش کا پورا خیال رکھتی ہے اور اس کا نام بھی بڑے ادب واحترام کے ساتھ لیتی ہے-اپنے شوہر کی خدمت کرنا اس کو سکون بہم پہنچانا اپنا فرض سمجھتی ہے-اس کا ماننا ہے کہ اگر دوسری عورتوں سے تعلقات استوار کر کے اس کے شوہر کو آسائش مل رہی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اس بات سے اعتراض نہ کرے-

لباس تہذیب و ثقافت کا ایک نہایت اہم عنصر ہے-ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے طبقے اور مقام و مرتبے کے مطابق لباس زیب تن کرتے ہیں-لباس سے ہم کسی کے پروفیشن کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں مثلاً ڈاکٹر نے اپنا ایک مخصوص سفید کوٹ، وکیل نے کالا کوٹ، اسی طرح جاگیر دار کا لباس اس کے مقام و مرتبے کے مطابق ہوتا ہے-مزارعے کا لباس اس کی حیثیت اور استطاعت کے مطابق ہوتا ہے-نوکر اور مالک کے لباس سے پتہ چلتا ہے کہ کون مالک اور کون نوکر ہے-غرض ہر شخص اپنے معیار اور مرتبے کے مطابق لباس زیب تن کرتا ہے-

پھاماں کا کردار ایک نوکرانی کا کردار ہے جو اپنے نام، لباس، طور اطوار سے اپنے طبقے کی عکاسی کرتی ہے-پھاماں ایک مضبوط جسم کی مالک عورت ہے جس کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہو چکی ہے دانت ٹوٹ چکے ہیں بالوں میں چاندی اتر آئی ہے لیکن رنگین مزاج ہے-مہندی لگا کر بالوں کو سرخ کیے رکھتی ہے-محلے کے مردوں کے ساتھ ہر وقت ٹھٹھا مذاق کرتی ہے محلے کے سب مرد اس کے شیدائی ہیں-پھاماں کا حلیہ بانو قدسیہ نے ایسا کھینچا ہے عموماً جیسے نوکروں کا ہمیں ارد گرد کے ماحول میں نظر آتا ہے-اس کا کا پیٹ بڑھا ہوا، ہاتھ پھٹے ہوئے، ہاتھوں پر برتن مانجھنے کی

لکیریں، دانت نکال کر اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرتی، ہر وقت کھانے پینے کی عادت، گفتگو کی شوقین اور مانگنے تانگنے کی لت میں مبتلا نظر آتی ہے -

> وہ ہٹی سلامت رہے 'اللہ جوڑی قائم رکھے۔۔۔اپنی پھٹی قمیض آگے ڈھلکا کر اس نے کہا۔۔۔ سہاگ قائم رہے-ایک جوڑا تو دے دو..... تم سے نہیں مانگوں گی تو بھلا کس کہوں گی ؟ [۳۸]

پھاماں مانگنے کی لت کا شکار ہے جیسا کہ عموماً یہ طبقہ اپنی مجبوریوں کا رونا رو کر اپنے مطالبات پورے کرواتا رہتا ہے-یہ کردار بھی ایسا ہی ہے پھاماں دعائیں دے کر اور خوشامد کر کے ہر وقت چیزیں بٹورتی رہتی ہے خود غرض عورت کے روپ میں جلوہ فروز ہوتی ہے۔موقع پرست یہ کردار جس گھر میں ملازمہ ہوتی ہے اس کے مالک سے نکاح کر کے گھر کی مالکن بن جاتی ہے- ہمیں اپنے ارد گرد کے ماحول میں میں اس طبقے کے جو لوگ نظر آتے ہیں وہ عموما ایسی ہی طبع کے ہوتے ہیں-پھاماں کو گالی گلوچ کرنے کی عادی اور بات بات پر بھڑک اٹھتی ہے اور لڑائی جھگڑے پر تیار ہو جاتی ہے-در حقیقت یہ کردار عیاری و مکاری کی علامت ہے۔

> مشٹنڈی رانڈ خضاب لگا لگا کر تو اپنا جھاٹا سیاہ کرتی ہے۔۔۔۔۔ چل خصم نوں کھانی۔۔۔ میری تو اب بھی کوئی نہ کوئی سار لیتا ہے۔۔۔ خصماں جلی تو تو ایسی ڈائن ہے کہ بات کر کے سب کا جی جلا دیتی ہے۔ [۳۹]

بانو قدسیہ نے اس کردار کو بڑی مہارت سے تخلیق کیا ہے- بانو قدسیہ کی کردار نگاری کا مجموعی طور پر جائزہ لیں تو بانو قدسیہ ایک منجھی ہوئی فنکارہ کے طور پر سامنے آتی ہیں-شہر لازوال آباد ویرانے میں ہر خطے مذہب اور پروفیشن سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو اپنے تمام تہذیبی و ثقافتی حوالوں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے-مصنفہ کے ہاں کرداروں میں تنوع پایا جاتا ہے-ناول کے تمام کردار ہمیں اپنے ارد گرد معاشرے میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں-ان کرداروں سے ہمیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی- حقیقی زندگی سے جڑے رنگا رنگ کیفیات کے حامل یہ کردار کثیر المذہبی، ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے، ہر طبقے کے ترجمان، قدیم اور جدید دور کے ،نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے والے مسلسل ارتقاپذیر نظر آتے ہیں-ناول کے جو کردار ناول کے شروع میں بظاہر عام نظر آتے ہیں درجہ بدرجہ ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے ناول میں ایک اہم مقام حاصل کر لیتے ہیں-ناول میں راحیلہ کا کردار ایک ایسا ہی کردار ہے جو کہانی کے ساتھ ارتقا کی منازل طے کرتا ہوا پوری کہانی پر چھا جاتا ہے-

بانو قدسیہ کی کردار نگاری کی یہ خوبی ہے کہ وہ کرداروں کے ذریعے سے اس علاقے کی تاریخ، ماحول اور تہذیب کو بھی پیش کرتی ہیں-کرداروں کی زبان عادات واطوار نشست و برخاست میں کردار ہمیں جیتے جاگتے محسوس

ہوتے ہیں - کرداروں کی پیشکش میں بانو قدسیہ لینڈ سکیپ کا خاص طور پر خیال رکھتی ہیں - جس خطے کا کردار ہے اس علاقے کے ماحول اور تہذیب کی مناسبت سے کردار تخلیق کرتی ہیں - کردار کی زبان اس کے علاقے کی ترجمان ہوتی ہے -یہی وجہ ہے کہ بانو قدسیہ کے کردار حقیقی زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں -

کرداروں کے نام تجویز کرتے وقت بانو قدسیہ اپنے کرداروں کے نام ان کے مذہب، طبقے اور ماحول کو کو مد نظر رکھ کر تجویز کرتی ہیں - کسی کردار کا نام پڑھ کر ہی اس کے مذہب، شعبے اور طبقے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے - ناول کے تمام کردار تہذیبی نقطہ نظر سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں - ناول کے تمام تمام مرکزی اور ضمنی کردار اپنے اپنے تہذیبی حوالے پیش کرتے ہیں - مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شہر لازوال، آباد ویرانے تہذیبی تناظر میں لکھا گیا ناول ہے - اس ناول میں دو بڑی تہذیبوں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے کرداروں کو پیش کیا گیا ہے - ان دونوں مذاہب کے علاوہ سکھ مذہب، ہندو مذہب، بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کے کرداروں کی پیشکش بھی بڑی عمدگی کے ساتھ ہوئی ہے - ناول کے کرداروں کی مدد سے صدیوں پرانی برصغیر کی ہندو مسلم تہذیب سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے -

مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے کرداروں کے علاوہ نئی تہذیب کے کرداروں کو بھی ناول کا موضوع بنایا گیا ہے - یہ کردار جہاں مسلم معاشرے کی تہذیبی زندگی کے آئینہ دار ہیں وہیں کچھ اینگلو انڈین کردار بھی نظر آتے ہیں جو اپنی تہذیب کو فراموش کر کے پوری طرح مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں - ان کرداروں کی زبان، لباس اور زندگی پر مغربی تہذیب کا گہرا اثر نظر آتا ہے - نئی نسل کے نمائندہ یہ کردار اپنی اقدار و روایات کو بھلائے مادی ترقی کے پیچھے دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - بانو قدسیہ نے ان کرداروں کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے - مختلف سماجی طبقات کے کردار طوائف، سیاستدان، بیوروکریٹ، ڈاکٹر، ایڈووکیٹ کی زندگیوں کو ان کی گفتگو کے ذریعے سے بے نقاب کیا ہے - ان کرداروں کی زبانی سیاسی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے -

بانو قدسیہ نے نچلے طبقے کے کردار نوکرانی، مالی، چوکیدار، کے کردار بھی تخلیق کیے ہیں - یہ تمام کردار اپنی علاقائی زبانوں میں بڑی روانی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں - اپنے حالات و واقعات کے ترجمان، داخلی کشمکش کو واضح کرتے ہوئے یہ کردار نفاست بھری زبان کا استعمال کرتے ہیں - بانو قدسیہ نے کرداروں سے کہیں بھی کوئی معیوب بات نہیں کہلوائی تمام کردار اپنے مرتبے کے مطابق زبان استعمال کرتے ہیں -

بانو قدسیہ کے کرداروں کی حیثیت ان کے لباس زبان اور طور اطوار سے نمایاں ہو جاتی ہے - مصنفہ ناول کے کرداروں کا حلیہ اس باریک بینی سے بیان کرتی ہیں کہ ان کی پوری زندگی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے - اونچے طبقے کے کرداروں میں بیوروکریٹ طبقے جاگیر دارانہ طبقے محلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے شاہانہ انداز

زندگی بسر کرنے والے کرداروں کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ پڑھ کر اس طبقے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے-اسی طرح نچلے طبقے نوکرانی، مالی، چوکیدار، نائی کے کردار میں ان کے معاملات زندگی، عادات واطوار بھی واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں-

نسوانی اور مردانہ کردار بھی اپنی اپنی جنس کے مطابق لب ولہجہ، عادات بول چال کا انداز اپنائے ہوئے ہیں- کرداروں کے ہاں مصنفہ نے مرد اور اور عورت کی نفسیات کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا ہے- عورت کو وفا کی دیوی، اپنے گھر کے لئے قربانیاں دینے والی اور مرد کو محض نان ونفقہ ادا کر کے ذمہ داریوں سے بری الزمہ دکھایا ہے-ان کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بانو قدسیہ کی ذاتی رائے بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے بانو قدسیہ عورت کو وفا کی دیوی کے روپ میں ہی دیکھنا پسند کرتی ہیں-

مختلف مذاہب کے کرداروں کو بیان کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے مسلم ہونے کے ناطے کہیں پر بھی اپنے مذہب کی طرف داری نہیں کی اور نہ ہی کسی دوسرے مذہب کے کردار سے کوئی اختلاف بغض یا تعصب نظر آتا ہے بلکہ مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر کرداروں کے ہاں صرف تہذیبی وثقافتی اقدار کا بیان ملتا ہے- ناول میں کہیں پر بھی مسلم تہذیب کی طرفداری نہیں کی گئی علاوہ ازیں مصنفہ ناول میں وقتاً فوقتاً کلچر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتی رہتی ہیں-ناول کے مسلم کرداروں کے ہاں انہوں نے مذہب اسلام کی تعلیمات کو تفصیلا بیان کیا ہے -نماز، روزہ ،صدقہ خیرات اسلام میں پردے کے بارے میں جو احکامات ہیں اور تمام اسلامی عقائد و نظریات کو کرداروں کی مدد سے تفصیلاً بیان کیا ہے-

بانو قدسیہ نے دوسرے مذاہب کے کرداروں کو پیش کرتے وقت کہیں پر بھی ان کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف کوئی بھی جملہ نہیں بولا-ان کے خداؤں سے ان کی مذہبی عقیدت کو بیان کرتے ہوئے احتیاط کا دامن پکڑے رکھا-

ناول کے فنی محاسن میں کردار نگاری بنیادی اہمیت کی حامل ہے کوئی بھی فن پارہ کردار نگاری اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا- شہر لازوال ،آباد ویرانے کے کردار ادبی محاسن اور فنی خوبیوں کا مجموعہ ہیں-ان کرداروں کی مدد سے قدیم اور جدید دور، مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور تاریخ، نئی سرزمین پر پروان چڑھنے والی تہذیب سے بھی آگاہی ملتی ہے-اپنی تہذیب سے بچھڑنے کا دکھ، وطن کی یاد کرداروں کے ہاں نظر آتی ہے-یہ بانو قدسیہ کی اپنی ذاتی کیفیات محسوس ہوتی ہیں -بہر کیف بانو قدسیہ نے کلچر کا نقشہ کرداروں کے ذریعے بڑے جامع انداز میں کھینچا ہے- ناول کے کرداروں کے رویوں سے ان کی تہذیب وثقافت سے وابستگی کا اظہار ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ ناول کے ہر کردار کی

جڑیں اپنی اپنی تہذیب و ثقافت سے جڑی ہوئی ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے ہر کردار اپنے رویوں اور طرزِ حیات سے اپنی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فرزانہ سید، نقوش ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء)، ص ۱-۴۔

۲۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۱۲-۱۱۳۔

۳۔ ایضاً، ص۔ ۱۵۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۷۴-۱۷۵۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۲۸-۳۲۹۔

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۰۔

۷۔ ایضاً، ص ۳۶۴۔

۸۔ ایضاً، ص ۳۳۴-۳۳۵۔

۹۔ ایضاً، ص ۴۵۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹۴-۲۹۵۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷۰-۲۷۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۸۵۔۲۸۶۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۶۶، ۱۸۴، ۳۷۱۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۸۶۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۶۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص۳۰۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص۹۵۔۹۶۔

۲۴۔ ایضاً، ص۲۲۹۔

۲۵۔ ایضاً، ص۲۵۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص۹۳۔۹۴۔

۲۷۔ ایضاً، ص۵۳۸۔۵۳۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص۴۴۶۔

۲۹۔ ایضاً، ص۴۸، ۵۰، ۵۴۔

۳۰۔ فیاض محمود، تاریخ ادبیات، مسلمانان پاک و ہند (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)، ص۵۲۴۔

۳۱۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۱۲۔

۳۲۔ ایضاً، ص۱۷۔

۳۳۔ ایضاً، ص۳۶۔۳۷۔

۳۴۔ ایضاً ص۸۔

۳۵۔ ایضاً، ص۱۴۔

۳۶۔ انور سدید، بانو قدسیہ: شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۔

۳۷۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۱۷۔

۳۸۔ ایضاً، ص۵۰۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص۵۰۰۔۵۰۱۔

باب سوم:

شہر لازوال، آباد ویرانے کی کہانی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کی شکست و ریخت کا تجزیاتی مطالعہ

باب سوم:

شہر لازوال، آباد ویرانے کی کہانی میں تہذیبی وثقافتی رویوں کی شکست وریخت کا تجزیاتی مطالعہ

بانو قدسیہ (۱۹۲۸ء تا ۲۰۱۷ء) معاصر عہد کی ایک نامور فکشن نگار خاتون تھیں۔ بانو قدسیہ نے حقیقت نگاری کی بنا پر اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا تھا۔ وہ ایک ماہر نباض کی طرح معاشرے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کاوش میں مصروف رہتی تھیں۔ مصنفہ کا مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ اس کی واضح دلیل ان کی تخلیقات ہیں جن میں وہ معاشرے کی سماجی برائیوں سے پردہ اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے لکھنے کا آغاز چھوٹی عمر میں افسانے سے کیا تھا۔ بانو قدسیہ بچپن سے ہی معاشرے کا گہری نگاہوں سے مطالعہ کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد مصنفہ نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا اور زندگی کی حقیقتوں، مشاہدات اور تجربات کو کاغذ پر اتارا۔ بانو قدسیہ کی نگاہ معاشرتی مسائل پر بہت گہری تھی۔ وہ معاشرے کا بغور مطالعہ کر کے معاشرتی اور سماجی برائیوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی تھیں۔ بانو قدسیہ کی تحریروں پر قیام پاکستان کے واقعے کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ مصنفہ نے اس واقعے کو رونما ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔ اس واقعے کی چشم دید گواہ ہونے کے ناطے مصنفہ نے ان حالات وواقعات کو مفصل انداز میں زیر بحث ناول میں پیش کیا ہے۔

راجہ گدھ اور شہر بے مثال جیسے مقبول ناولوں کی تخلیق کار کا یہ ناول شہر لازوال، آباد ویرانے بانو قدسیہ کی وفات کے بعد ۲۰۱۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ سنگ میل پبلی کیشنز کی توسط سے منظر عام پر آنے والا یہ ناول ۵۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کا نمایاں پہلو معاشرتی وسماجی مسائل اور تہذیبی وثقافتی رویے ہیں۔ شہر لازوال آباد ویرانے دو حصوں پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے جس کے پہلے حصے میں دو کہانیاں شہر لازوال اور کاشف کی کہانی کے عنوان سے ہیں۔

ناول کا پہلا حصہ محض ۶۸ صفحات پر مشتمل دو مختصر کہانیوں پر محیط ہے۔ جس میں مصنفہ نے متعدد چھوٹے بڑے قصوں کے توسط سے سماجی برائیوں سے پردہ اٹھانے کی کاوش کی ہے۔ ناول کے دوسرے حصے آباد ویرانے میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا تفصیلاً ذکر ملتا ہے۔ بانو قدسیہ کا بچپن ایک مخلوط ہندوستانی معاشرے میں گزرا تھا۔ قیام

پاکستان سے قبل برصغیر کے سیاسی و سماجی حالات کیسے تھے؟اس کثیر المذہبی معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے رویے کیسے تھے؟ برصغیر پاک وہند کا کلچر کیسا تھا؟ان تمام باتوں کو بانو قدسیہ نے ناول میں بڑی باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے- برصغیر کی تاریخ کا ایک اہم موڑ برصغیر کی تقسیم کا واقعہ محض دو ملکوں کی تقسیم نہیں تھی بلکہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ اس کی تہذیب بھی شکست وریخت کا شکار ہوئی-

ہجرت کے وقت لوگ جس داخلی کرب سے گزرے اس کا بیان ان ناول کے دوسرے حصے میں تفصیل کے ساتھ ملتا ہے- بانو قدسیہ نے ناول میں ان واقعات کو پوری جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے-مصنفہ نے تقسیم سے پہلے ہندوستان میں جو سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، تقسیم کے وقت کے فسادات، قتل وغارت، عورتوں کا جنسی استحصال ان تمام دل سوز واقعات کا بیان بھی ناول کے دوسرے حصے میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے-

شہر لازوال آباد ویرانے بانو قدسیہ کے دیگر تمام ناولوں کی نسبت ایک قدرے مختلف نوعیت کا ناول ہے-ناول کے دونوں حصوں کا بظاہر آپس میں کوئی ربط نہیں ہے-ناول کا پہلا حصہ جدید پاکستانی معاشرے پر محیط ہے جبکہ دوسرا حصہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب وثقافت پر مشتمل ہے-دونوں حصوں کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے اور نہ ہی ناول کے اختتام پر بانو قدسیہ ان دونوں کہانیوں کا آپس میں کوئی تعلق پیدا کرتی ہیں-یہ ایک انوکھی طرز کا ناول ہے-جس میں ناول کا پہلا حصہ قیام پاکستان کے چالیس سال بعد کا زمانہ دکھایا گیا ہے اور دوسرا حصے میں مصنفہ نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب، برصغیر کی تقسیم، تقسیم کے وقت فسادات، جدید پاکستانی معاشرے کے مسائل اور سماجی برائیوں سے پردہ اٹھایا ہے-

بانو قدسیہ نے اس ناول کی تھیم یہ رکھی ہے کہ "لاہور شہر جو بے پناہ ناپاک لوگوں سے آباد ہے' کیسے ابھی تک آباد ہے.... غالباً کچھ اللہ کے بھگت اس دھرتی پر آباد ہیں جو اس کے لیے دعا گو ہیں-" ناول کی تھیم سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بانو قدسیہ نے لاہور شہر کی سماجی ومعاشرتی برائیوں کو ناول کا موضوع بنایا ہے-ناول کی پہلی کہانی میں بانو قدسیہ نے لاہور شہر کے باسیوں کو اخلاقی پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے-اخلاق سے عاری شہریوں پر بانو قدسیہ نے کڑی تنقید کی ہے-پہلی کہانی شہر لازوال ۴۵ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کہانی ہے-جس میں متعدد واقعات تخلیق کر کے بانو قدسیہ نے سماجی برائیوں کو منظر عام پر لایا ہے-

ناول کی پہلی کہانی شـــــہر لازوال میں بانو قدسیہ نے تہذیبی وثقافتی رویوں میں میں مذہب، سماج اور سیاست کے حوالے سے شکست وریخت کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے-مصنفہ ایک ایسے معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں-جو قیام پاکستان کے بعد اپنے ہی ملک کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا-ان لوگوں کے رویوں کو دیکھ کر

یہ نہیں لگتا کہ یہ ملک انہوں نے ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے۔ پاکستان کے قیام کا مقصد تھا کہ مسلمان اس ملک میں اپنے مذہبی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں لیکن پاکستانی معاشرے میں لوگ اپنی مذہبی اقدار کو کچل کر مادہ پرستی کی دوڑ میں اخلاقیات کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ سیاست دان ملک کے نفع و نقصان کی پرواہ کیے بغیر محض اپنی جیبوں کو بھرنے کے لئے ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

مذہب اسلام میں طلاق کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے لیکن اپر طبقے کی خواتین میں یہ فعل عام ہے۔ تین تین شادیاں کرنے کے بعد طلاق لے کر غیر مردوں کو اپنی طرف لبھاتی دکھائی دیتی ہیں۔ عورتوں کی سنگت سے زیادہ مردوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتی ہیں۔ نت نئے ہتھکنڈے آزما کر مردوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی۔ رنگ برنگی خوشبوؤں اور کولون کا استعمال کرتی تاکہ مردان میں دلچسپی لیں۔ اپنی بچیوں کی تربیت کی طرف سے لاپرواہ عورتیں یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ غیر مردان کی نابالغ بچیوں میں دلچسپی رکھتے ہیں احتیاط نہیں برتتیں۔ مردوں کا ان کے گھروں میں آزادانہ آنا جانا تھا۔ غیر مردوں کے ساتھ بچیاں گھل مل کر اپنے انتہائی ذاتی نسوانی مسائل بھی ان سے بیان کرتی۔ یہ سب باتیں جانتے بوجھتے ہوئے بھی مائیں اسے معمول کا حصہ سمجھتیں ہیں۔

اس طبقے کی عورتیں ہر وقت غیبت کرنے میں اور دوسروں کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف رہتیں۔ اپنے شوہروں اور بیٹوں کو دوسری عورتوں کی تحویل میں دیکھ کر بھی مطمئن زندگی گزارتیں ہیں۔ خود بھی ایک سے زیادہ مردوں سے تعلقات رکھتیں ہیں اور ان کے خیال میں شوہر کے لیے بھی دل بڑا کر لینا چاہیے کہ ایک عورت سے مرد کا دل اوب جاتا ہے۔ اپر طبقے کی یہ بیگمات اپنے شوہروں کے غیر عورتوں سے تعلقات پر اس وجہ سے خاموشی اختیار کیے رکھتیں کہ انہیں ہر طرح کی آسائش مل رہی ہے تو مرد جو جی میں آئے کرتا پھرے۔ اپنے شوہروں کو بلیک منی سے جائیدادیں بنانے کے مشورے دیتیں ہیں۔ اگر کوئی دوسری عورت کسی کار خیر میں حصہ لیتی بھی ہے تو اس کو سراہنے کے بجائے اس کی غیبت کرتیں۔ حسد اور رقابت کے جذبے کی اس سوسائٹی کی عورتوں میں فراوانی تھی۔

اعلیٰ طبقے کے مرد منافق ہیں۔ جن عورتوں سے جسمانی تعلقات استوار کیے ہوئے ہیں۔ معاشرے کے سامنے ان سے تعلق ظاہر کرنے میں شرم محسوس کرتے اور منافقانہ رویہ اپناتے۔ ڈھلتی عمر میں بھی ان مردوں کی نیت نہ بدلتی۔ چھوٹی نابالغ لڑکیوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے۔ اپنی ڈھلتی عمر اور بچیوں کی کم سنی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ مرد عورت کو صرف جنس کے روپ سے ہی تعبیر کرتا ہے۔ عورت کو محض روپیہ پیسہ تحفے تحائف دے کر بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ کبھی بھی کسی عورت کا سہارا نہیں بنتا۔

فیوڈل یا بیوروکریٹ ایک ایسا خود پسند طبقہ تھا جس میں دولت کی فراوانی تھی۔ لوگ ناجائز کمائی سے بینک

بیلنس بنا رہے تھے۔غلط کاموں میں ایک دوسرے کا سہارا بنتے اور مل کر پیسے بناتے۔اس معاشرے میں عورت صرف جسمانی ضرورت کی ایک چیز سمجھی جاتی تھی۔محبت کے نام پر عورتوں کو بیوقوف بنایا جاتا اور استعمال کرنے کے بعد انہیں پھینک دیا جاتا اور عورت مدد کے لئے جب بھی کسی مرد کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو اس کو دولت کی خواہش سے تعبیر کیا جاتا۔

اس معاشرے میں خونی رشتوں کی بے حرمتی کی جا رہی تھی۔زیادتی ہو جانے کے باوجود بھی لڑکیوں کو خاموش رہنے کا کہا جاتا کہ مرد تو ہر بات سے بری الذمہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ عورت کے کردار پر ہی انگلی اٹھائی جاتی ہے۔ اس معاشرے کے نوجوان غیرت کے نام پر اپنا اور دوسروں کا قتل تو آسانی کے ساتھ کر دیتے ہیں لیکن کسی کے سر پر عزت کی چادر نہیں ڈالتے۔سیاسی حالات اس قدر خراب تھے کہ لوگ کسی بھی سیاستدان پر یقین نہیں رکھتے تھے۔اپنا ووٹ ضائع کر دیتے لیکن کسی کو ووٹ نہیں دیتے تھے۔ملک کے سیاسی حالات سے مایوس لوگ یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان سیاستدانوں نے کبھی عوام کا بھلا نہیں چاہا عوام کو صرف لوٹتے ہیں۔

ناول میں بانو قدسیہ نے ایک طوائف کو اقدار کی شکست و ریخت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔طوائف محض دولت کی پجارن ہے۔شادی شدہ خاتون ہونے کے باوجود وہ اپنی معاشرتی روایات کو پس پشت ڈال کر غیر مردوں سے تعلقات استوار کرتی ہے۔وہ اپنی ساری زندگی اعلیٰ طبقے کے لوگوں، نوابین، جاگیرداروں، سیاستدانوں کی آسائش کا سامان مہیا کرنے میں گزار دیتی ہے۔

> رخشندہ جیسے ماحول میں رہ رہی تھی کم از کم اس بالائی جیسے اوپر والے ماحول میں عورت اور روپیہ....ان دونوں نے مل کر مرد کا خوب استحصال کیا تھا اور خود مرد کے استحصال کا نشانہ بنی تھی۔ کم از کم اس سوسائٹی کی عورت جس میں رخشندہ رہتی تھی۔یہاں کی عورتیں بے وقعت تھی۔سر بازار منہ کھولے' بال بکھرائے پھر رہی تھی اور کوئی اسے مقید کرنے کو تیار نہ تھا۔روپے نے عورت کے ساتھ اپنا رول بدل لیا تھا اور دونوں معجوب تھے۔عورت اور روپے کا کوئی مرکز' کوئی حدود اربعہ' کوئی جہت باقی نہ رہی تھی۔[1]

ناول کی کہانی میں بانو قدسیہ نے طوائف کی داخلی خود کلامی کے ذریعے سے اس کردار کی ذات میں ہونے والی شکست و ریخت کو بیان کیا ہے۔ہزاروں لوگوں کی منظور نظر دولت کی کسوٹی میں تولی جاتی ہے۔اس کا اپنا کوئی خاندان نہیں ہوتا، کوئی گھر نہیں ہوتا، ڈھلتی عمر اور مستقبل کا خوف اس کی راتوں کی نیند لے اڑتا ہے۔اس کردار کی نفسیاتی کشمکش کو بانو قدسیہ نے جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔کوئی بھی شخص اپنی مذہبی حدود کو پس پشت ڈال کر جب کوئی کام

کرتا ہے تو اس سے ذہنی سکون کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ طوائف بھی جس معاشرے میں رہ رہی ہے اپنی معاشرتی روایات کو بھلا کر وہ مردوں سے ناجائز تعلقات استوار کرتی ہے۔

لاہور میں مقیم یہ کردار جس کلچر میں رہائش پذیر ہے نہ تو اس کا مذہب اور نہ ہی معاشرہ اسے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کئی ہوٹلوں اور کمروں کی زینت بنے۔ رخشندہ اپنی تمام تر مذہبی حدود کو پھلانگ کر ہر طرح کی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف دولت کی چاہ میں، گناہ اور ثواب کی تفریق کیئے بغیر جب یہ گھناؤنا کاروبار کرتی ہے، آخر کار تہی داماں رہ جاتی ہے۔ کوئی بھی شخص اس کا سہارا بننے کو تیار نہیں ہوتا ہر کوئی اسے ضرورت کی چیز سمجھ کر استعمال کے بعد پھینک دیتا ہے۔ یہ کردار اپنے مذہب اور معاشرتی اقدار سے بغاوت کر کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔

بانو قدسیہ نے طوائف کے کردار کو معاشرے میں اقدار کی شکست و ریخت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے کٹ کر طوائفیں کبھی بھی حقیقی خوشی سے ہمکنار نہیں ہو پاتیں۔ ساری عمر انہیں تنہائی اور بڑھاپے کا خوف چین کی نیند نہیں سونے دیتا۔ طوائف کو ہمیشہ یہ سوچیں تنگ کرتی رہتی ہیں کہ اس کا کوئی خاندان نہیں وہ کس کے سہارے اپنا بڑھاپا گزارے گی۔ دولت کی ریل پیل کبھی ایک خاندان کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی اور نہ ہی دولت سے طوائف کبھی قلبی اطمینان حاصل کر سکتی ہے۔ تنہائی اور ذہنی الجھنوں کے شکار ایسے لوگ جذباتی ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو اپنے مذہب اور معاشرے سے بغاوت کرتی ہے۔ رخشندہ خود کو قتل کے کیس سے بری کروانے کے لیے قتل کیس کے انچارج پولیس افسر سے تعلقات رکھتی ہے۔ کیس کی آخری سنوائی تک اس پولیس افسر کا اس کے گھر آنا جانا رہتا ہے۔ رخشندہ کی ان نوازشات کے صلے میں وہ قتل کیس سے بری ہو جاتی ہے۔ بانو قدسیہ نے پولیس کے شعبے پر کڑی تنقید کی ہے کہ قتل جیسا بڑا جرم بھی معاشرے میں اس قدر عام ہو چکا ہے کہ محض ایک عورت کے جسمانی بلاوے پر قانون کے رکھوالے اپنا فرض بھلا کر اس جرم پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے ناول میں ایک لیڈی ڈاکٹر کا کردار تخلیق کیا ہے۔ اس کردار کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے پاکستانی معاشرے کی ایک اہم برائی جعلی ڈگریوں کا آسانی سے حصول کو بیان کیا ہے۔ اس معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ڈاکٹری جیسی حساس ڈگری بھی جعلی آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ عوام کے اندر پیسہ بنانے کی دھن اس قدر سوار ہے کہ وہ ہر ناجائز کام کو بھی پیسوں کے لالچ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کر لیتے ہیں۔ یہ لیڈی ڈاکٹر بھی لالچ میں آ کر پیسہ بنانے کی خاطر ایک ڈاکٹر سے شادی رچاتی ہے۔ اس شادی کا مقصد محض جعلی ڈگری کا حصول تھا۔ اپنے مقصد میں

کامیاب ہونے کے بعد وہ شوہر کا ناتو احترام کرتی ہے اور نہ ہی اس کے خاندان کا احترام کرتی ہے۔اپنے بچوں کے ساتھ مل کر شوہر اور اس کے خاندان کا مذاق اڑاتی ہے۔

جس پاکستانی معاشرے میں یہ کردار رہائش پذیر ہے اس کا نظام مادر سری نہیں ہے، اپنے معاشرتی نظام کے بر خلاف وہ گھر میں بھی اور اپنے کلینک میں بھی اپنے شوہر پر حاوی رہتی ہے۔بے باک گفتگو کرنے والی یہ ڈاکٹر اسقاط حمل جیسا بڑا گناہ محض پیسوں کی خاطر کرتی ہے۔اس حرام کمائی سے وہ کئی کوٹھیاں، مربعے اور ملیں کھڑی کر چکی ہے۔ اس تمام مال و دولت کو وہ اپنے نام کیے ہوئے ہے اور اس کا سارا حساب کتاب خود کرتی ہے۔

بانو قدسیہ نے اس کردار کے ذریعے سے پاکستانی معاشرے کی بہت سی برائیوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اس معاشرے کا نظام اس برے طریقے سے بگڑ چکا ہے کہ رشوت دے کر ناجائز کام کو بھی جائز بنایا جاسکتا ہے۔ یہ کردار اپنے کلچر اور مذہب سے دور معاشرتی اور مذہبی اقدار و روایات کی شکست و ریخت کا شکار ہے۔اس بات کا علم رکھنے کے باوجود کہ حرام طریقے سے حاصل کی گئی کمائی کا اثر نسلوں تک رہتا ہے۔نسلیں بھی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہیں۔پاکستانی معاشرے میں ناجائز طریقے سے دولت کمانا عام بات بن چکی ہے۔

بانو قدسیہ نے ناول کے پہلے حصے میں اقدار کی شکست کو سید گھرانے کی ایک لڑکی کے کردار کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔معاشرے میں عورت کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے اور جسمانی اور ذہنی سطح پر بھی عورت کا استحصال ہو رہا ہے۔جنسی بے راہ روی معاشرے میں اس قدر عام ہو چکی ہے کہ انسان خونی رشتوں کا تقدس بھی پامال کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔معاشرے کا ایک ایسا ہی ہوس پرست کردار اپنی سگی بھانجی کی عزت تار تار کر دیتا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں مذہبی اقدار کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔خونی رشتوں کے تقدس کا بھی لحاظ نہیں رہا۔ عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی معاشرے میں ایک عام بات بن چکی ہے۔سید گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو اس کا سگا ماموں جنسی زیادتی کا نشانہ بناتا ہے۔جس کے نتیجے میں اس کا حمل ٹھہر جاتا ہے۔یہ کردار اخلاقی پستی کا نمونہ ہے۔اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے اس حد تک گر چکا ہے کہ وہ ماموں اور بھانجی کے پاکیزہ رشتے کا تقدس بھی پامال کر دیتا ہے۔اپنی مذہبی اقدار کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

معاشرہ جب اپنی مذہبی و اخلاقی اقدار سے باغی ہو جاتا ہے۔اپنے مذہب سے دوری اختیار کر کے اپنی اقدار اور روایات کو فراموش کر کے ہوس بے مہار آزادی کو اپنا لیتا ہے تو ایسے معاشرے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ایسے معاشرے تہذیبی اور اخلاقی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔جنسی ہوس کا نشانہ بننے والے اس کردار کی ماں بجائے اپنے بھائی کا گریبان پکڑنے اور اسے اس جرم کی سزا دلوانے کے اپنی بیٹی کو خاموش رہنے کا کہتی ہے۔خاندان کی بدنامی کے ڈر سے اسے

اسقاط حمل کے لیے کلینک لے آتی ہے-اس کردار کے اسقاط حمل نہ کروانے کے اصرار پر اور منگیتر کو ساری حقیقت بتا دینے کا سن کر کہتی ہے کہ اگر تم کسی سے اس واقعے کا ذکر کرو گی تو ہمارا معاشرہ ایسا ہے کہ مرد کو لعنت ملامت کرنے کے بجائے عورت کے کردار پر ہی انگلی اٹھاتا ہے-

ایسے حالات میں کوئی شخص اس سے شادی کے لئے تیار نہ ہو گا-جس عورت کی عزت پامال کی جاچکی ہو ایسی عورت کو معاشرے میں کوئی بھی قبول نہیں کرتا چاہے اس میں اس کی کوئی غلطی نہ ہو-عورت کے جسم کے ساتھ کھلواڑ تو سب ہی کرتے ہیں- جھوٹی محبت کا لالچ دے کر استعمال کرنے کے بعد چھوڑ جاتے ہیں لیکن کوئی عزت کی چادر نہیں اوڑھاتا- جنسی زیادتی کا نشانہ بننے والے اس کردار کے نزدیک معاشرے میں یہ فعل اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے ماموں کا اسے جنسی زیادتی کرنا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ ایک بچے کا قتل کرنا اس کے نزدیک زیادہ بڑا گناہ ہے-اسے اپنے منگیتر کی محبت پر بہت یقین ہے کہ وہ جب اسے بتائے گی کہ اس کے والد نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے تو وہ اپنے والد کے بجائے اس کا ساتھ دے گا-

> دفع دور۔۔۔لعنت-پھر اسی ماموں کے پاس بھیج دوں جس کے پاس یہ منہ کالا کروا کے آئی ہے سیدانی پھر رونے لگیں اور دیر تک روتی رہیں۔۔۔"میرا سگا بھائی-میرا اپنا سگا بھائی....اس کی اپنی سگی بھانجی....اور.....کس بات کا اعتبار کریں...اب تو بتا مجھے برداشت کرے گا اس بات کو....یہ پاگل تو کہتی ہے کہ منیر کچھ نہیں کہے گا پر اسے کیا پتہ-پاگل بیوقوف!..[۲]

اپنی سگی بھانجی کے ساتھ زیادتی ایک ایسا گھناؤنا جرم ہے-جس کو سن کر طوائف کے پیروں تلے سے بھی زمین نکل جاتی ہے-طوائف جس کا پیشہ ہی مردوں کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کرنا ہے وہ بھی رشتوں کا اس برے طریقے سے تقدس پامال ہو جاتا دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے-سماج میں اخلاقی اور مذہبی اقدار ناپید ہو چکی ہیں-رشتوں کا دم توڑتا ہوا تقدس اس کے ماموں کا کردار ہے جو خونی رشتے تک کا لحاظ نہیں کرتا-

سید گھرانے سے تعلق رکھنے والا یہ کردار ہوس پرستی میں اپنے اعلی حسب و نسب کا بھی خیال نہیں کرتا-اخلاقی قدروں کے زوال نے انسان کو خونی رشتوں سے بے اعتبار کر دیا ہے-اس نفسا نفسی اور ہوس پرست معاشرے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا- حتیٰ کہ خونی رشتوں سے بھی اعتبار اٹھ چکا ہے-اگر خونی رشتے نفسانی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیں تو انسان اپنوں سے بھی اعتبار کھو دیتا ہے-

ناول میں ایک سید گھرانے سے تعلق رکھنے والے کردار کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے جاگیر دار طبقے میں پائی جانے والی برائیوں کو نشانہ بنایا ہے-یہ جاگیر دار رشوت کے زور پر ملک کے سیاستدانوں اور پولیس کے اعلی افسران کو

خرید لیتا ہے- اپنے علاقے کے مزارعوں پر حکومت کرتا ہے، ان کی زندگیوں کا تمام نظام اس کے ہاتھ میں ہے- ملک میں اسلامی نظام رائج کرنے کی باتیں کرتا ہے لیکن خود ہر وہ کام کرتا ہے جس کی مذہب اسلام میں اجازت نہیں ہے شراب نوشی اور طوائفوں کے ساتھ تعلقات قائم کیے ہوئے ہے-

> اس بار سید صاحب نے دوستوں کو اپنے گھوڑوں کے سٹڈ دکھانے اور مرغابی' جل مرغی اور تیتر کے شکار پر لے جانے کے بجائے شہر میں قوالی اور مشاعرے کا انتظام کر رکھا تھا۔ "سید صاحب کے حواری ننگے پیر سیامی بلیوں کی طرف وہسکی اور سوڈا لیے پھرتے لیکن سید صاحب "قسمت پروانہ کیست" کے نشے میں کچھ ایسے سرشار تھے کہ صبح تین بجے تک انہوں نے جتنی بھی پی دوستوں کے اصرار پر پی ورنہ وہ تو دولت صحبت سے ہی سرشار ہو چکے تھے۔[3]

بانو قدسیہ نے اس کردار کے رویے پر طنز کیا ہے- یہ اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے والا زوال پذیر کردار ہے جو بظاہر انسانیت کے اعلی درجے پر فائز ہے- خود کو دیندار ظاہر کرنے والا یہ جاگیر دار در حقیقت اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑاتا پھر رہا ہے- سید اکرم شاہ بات بات پر پنجتن پاک کی قسمیں کھاتا، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا نام لیتا ہے لیکن اس کے اپنے کردار میں مذہبی انحراف پایا جاتا ہے-

اس کی اپنی شخصیت میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا بحران نظر آتا ہے- عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا یہ کردار ایسی محفلیں منعقد کرواتا ہے جس میں ملک کے بڑے بڑے افسران، سیاستدان اور اعلی طبقے کی طوائفوں مدعو ہوتیں- ان محفلوں میں کھلم کھلا شراب نوشی کی جاتی- اپنی راتوں کو رنگین بنانے کے لیے طوائفوں کو گھر لا کر رکھتا ان کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے مارتا- اس کے پیسے کی طاقت کی وجہ سے سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور آگے پیچھے پھرتے-

جاگیر دارانہ نظام سے تعلق رکھنے والا ایک جاگیر دار کی بیوی کا کردار تخلیق کر کے کے بانو قدسیہ نے جاگیر داروں کی خانگی زندگی کو منظر عام پر لایا ہے- اس کردار کا ماحول ایسا ہے کہ گھروں میں طوائفیں لانا ان کے ساتھ راتیں بسر کرنا ایک عام بات خیال کی جاتی ہے- یہ کردار بھی اپنے شوہر کے گھر لائی ہوئی طوائفوں کی دل و جان سے خدمت کرتی ہے-

اس کردار کے نزدیک اگر شوہر کسی سے تعلق قائم کر کے دو گھڑی سکون حاصل کر لیتا ہے تو عورتوں کو اس بات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اپنے شوہر کو آرام و سکون پہنچانا بیوی کا فرض ہے- وہ دوسری عورتوں سے رقابت یا حسد کا جذبہ نہیں رکھتی- اس کے نزدیک جو مقام و مرتبہ اس کو حاصل ہے، کوئی دوسری عورت اس مقام کو نہیں پہنچ سکتی- اس کا ماحول ہی ایسا ہے جہاں سب وڈیرے عیاش ہیں غیر عورتوں کے ساتھ ناجائز تعلقات معمول کی

بات ہے۔اس لیے وہ شوہر کی گھر لائی ہوئی طوائفوں کی خدمت میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتی۔

میں اس چندری بیبو کو آکھیا۔۔۔

ہے بیبو کم زات۔۔۔بیبو ایتھے آ۔۔۔مر۔

اے! مر ونجیں لتاں گھٹ ایتھے بہہ کے۔۔۔۔

گھٹ بیبو۔۔۔

ہتھ چلا گھٹ ایناں کوتاں مر موئی ایں جاکے۔۔۔

اوئے بیبو۔رنڈی تھیویں ایہہ گرم پانی پلان لگی ایں' [۴۰]

جاگیر دارانہ نظام کے نمائندہ اس کردار کا اپنے مزارعوں کے ساتھ رویہ روایتی وڈیروں جیسا ہے۔وڈیرے اپنی دولت کے گھمنڈ میں انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔بات بات پر نوکروں کو گالیاں دیتے ہیں،ان کو ذلیل ورسوا کرنا اس طبقے کا معمول ہے۔شاہنی اپنی ملازمہ کو بلاوجہ بے نقط باتیں سنادیتی ہے۔بات بات پر گالیاں دیتی کی کمین ہونے کے طعنے دیتی ہے۔ناول کی کہانی میں مزارعے کے کردار کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے ظلم کی چکی میں برسوں سے پستے ہوئے ان غریب مزارعوں کی مشکلات کو بیان کیا ہے جو جاگیر دار طبقے کے نسل در نسل غلام ہوتے ہیں۔یہ بری طرح عزت مجروح ہونے کے باوجود بے بسی کی تصویر بنے گالیاں کھاتے اور وڈیروں کے خدمت میں مصروف رہتے ہیں کیونکہ یہ ان کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں۔اپنے معاملات زندگی میں کہیں پر بھی ان کی اپنی مرضی نہیں چلتی۔ان کے آباؤاجداد کی زندگیاں اور آنے والے نسلوں کی زندگیاں ان جاگیر داروں کی غلامی میں گزر جاتی ہیں۔

جاگیر دار عوام کو بے وقوف بنا کر ان کی نظروں میں خود کو عظیم ثابت کر کے علاقے کے لیڈر بن جاتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے ناول میں ایک ایسا ہی کردار دکھایا ہے جس کی ساری زمین کو کلر لگ جاتا ہے۔جب زمین اس کے اپنے کسی کام کی نہیں رہتی تو وہ مزارعوں میں یہ بے کار زمین بانٹ دیتا ہے۔تاکہ مزارعے اس سے خوش ہو کر اسے ووٹ دیں اور اپنے اوپر لیڈر منتخب کر لیں۔

روایتی جاگیر داروں کی طرح اس جاگیر دار میں بھی ہر اخلاقی برائی پائی جاتی ہے۔عیاش طبیعت کا مالک یہ کردار تین شادیاں کر چکا ہے۔لوگوں کے سامنے خود کو نیک ظاہر کرتا ہے لیکن اپنی ذاتی محفلوں میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتا ہے۔اپنے ناجائز کام کروانے کے لئے اعلیٰ افسران کو رشوت دیتا ہے۔اخلاقی اور معاشرتی تمام برائیاں اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔منافقت کا لبادہ اوڑھے لوگوں کے سامنے خود کو نیک اور پاکیزہ ظاہر کرتا ہے۔

جاگیر دار طبقے کا نمائندہ کردار بانو قدسیہ نے ایک نواب کا کردار تخلیق کیا ہے۔یہ نواب ایک باحیثیت اور

طاقتور شخصیت ہے-اس کے مزاج میں رعونت اس قدر ہے کہ اس نے وائسرائے تک کا انتظار کبھی نہ کیا تھا-اس کے ہاں مال و دولت کی فراوانی تھی-کئی شہروں میں اس کی دولت کے چرچے تھے-

فطرتاً یہ نواب ایک رنگین مزاج شخص تھا-عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن مزاج کی رنگینی ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی-عموماً نوابوں کے جیسے شوق ہوتے ہیں-بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومنا پھرنا، روپے پیسے کو پانی کی طرح بہانا، طوائفوں کے ساتھ تعلقات، ملک کے نامور ہاؤسنگ سوسائٹی میں قیام پذیر یہ نواب دوسرے شہروں میں محض طوائفوں سے ملاقات کے لئے جاتا-مہنگے مہنگے ہوٹلوں میں ان عورتوں کو بلواتا ان کو پیسے دے کر خرید لیتا-طوائفیں اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کی طرف دیکھیں اس کی انا اس بات کی اجازت نہیں دیتی-بڑھاپے میں پہنچ کر عورتوں سے تعریفیں وصول کر کے ہی خوش ہو جاتا-ان خدمات کے عوض انہیں ہیرے جواہرات کے قیمتی تحفے تحائف دیتا-

بانو قدسیہ نے اس کردار کے ذریعے سے ملک کے نوابین کا رویہ بیان کیا ہے کہ وہ کس قدر شوقین مزاج ہوتے ہیں-قبر میں پاؤں لٹکائے ہوتے ہیں لیکن ان کی عادات نہیں بدلتیں ساری زندگی ان کی جن کاموں میں گزرتی ہے آخری عمر میں بجائے توبہ استغفار کرنے کے بے حیائی کے کاموں میں ملوث نظر آتے ہیں-اس کردار کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے سماج کا عمومی رویہ بھی بیان کیا ہے-طوائفیں بھی تحفے تحائف کے لالچ میں بوڑھے نوابین کی جھوٹی تعریفیں کرتی، آگے پیچھے پھرتی اور ان کا دل بہلاتی ہیں-

بیوروکریٹ طبقے کا نمائندہ کردار ایک جنرل جو اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر حرام کمائی سے شہر کے پوش ایریا میں کوٹھی، مربعے، ملیں اور بے تحاشا جاگیر بنالی تھی-اس کی ہر شے سے عمارت ٹپکتی تھی- ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ کردار عوام سے ہتک آمیز سلوک کرتا ہے اور کامیابی کے نشے میں چور اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے کہ کوئی اس کے آگے کچھ بولنے کی جسارت نہیں کر سکتا-عہدے اور طاقت کا نشہ اس قدر حاوی تھا کہ کوئی شخص اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا-اس عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ رشوت لے کر دولت کے انبار لگا چکا تھا-بیوروکریٹ طبقے سے تعلق رکھنے والا یہ کردار ایک منافق شخص ہے جو اپنے ہی ملک کو لوٹ رہا تھا رشوت لیتا اور حرام کماتا ہے-مذہب اسلام میں بھی حرام کمائی جائز نہیں اور نہ ہی ایک محب وطن پاکستانی جو فوج میں ملازم ہو اس کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ محض دولت کے لالچ میں آکر اپنے ملک کو نقصان پہنچائے-

جنرل نے اپنی بیوی کی موجودگی میں غیر عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کیے ہوئے ہیں-طوائفوں

کے ساتھ گھومتا پھرتا-اس کے گناہوں کے نتیجے میں اس کے خاندان کی عزت و ناموس پر کوئی حرف نہ آئے- کھلم کھلا ان عورتوں سے اپنا رشتہ تسلیم نہ کرتا-ان سے کئی بار اسقاط حمل جیسے کبیرہ گناہ سرزد کرواچکا تھا-

جنرل صاحب گو کئی جنگی اعزاز حاصل کر چکے تھے لیکن اس معاملے میں ان کا دل بہت چھوٹا تھا- وہ سمجھتے تھے کہ ایسا بچہ ان کے کیریئر، شہرت اور ناموس اور خاندانی سالمیت کے لیے بہت بڑا گھپلا ثابت ہو سکتا ہے-[5]

جنرل بختیار طوائفوں سے جسمانی تعلق قائم کرتے وقت یہ بات نہیں سوچتا کہ اس کا مذہب اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی غیر محرم کے ساتھ ایسا رشتہ رکھے جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کو معاشرہ قبول نہ کرے-جنرل بختیار اپنے گناہوں کو چھپانے کے لیے بچوں کا قتل کروادیتا ہے اور ان جوان لڑکیوں کو یہ کہہ کر بیوقوف بناتا ہے کہ بچوں کے ساتھ اپنی جان عذاب میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے-بچے پیدا کر کے تم خوبصورت نہیں لگو گی- درحقیقت وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کہ ان بچوں کو اپنا نام نہ دینا پڑے-جنرل کے عہدے پر فائز ہو کر منافقانہ رویہ اپنا کر جو نام نہاد عزت اور نام کمایا ہے وہ مٹی میں نہ مل جائے-

اس کردار نے معاشرے میں چہرے پر نقاب چڑھا کر اپنے کردار کی پستی کو چھپا کر جو مقام حاصل کر رکھا تھا کہیں اس کو دھچکہ نہ لگے-اس خیال کے تحت وہ ایک ایسے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے جس کی ہمارے مذہب میں بہت سخت سزا ہے-زنا کرنے والے کے لیے مذہب اسلام میں ویسے بھی بہت سخت سزا کی وعید سنائی گئی ہے اور بیوی کے ہوتے ہوئے بھی زنا جیسا گناہ کا مرتکب ہونے والا شخص اور بھی سخت سزا کا مستحق ٹھہرتا ہے-

ناول کی کہانی میں ایک اینگلو انڈین کردار جو مکمل طور پر مغربی کلچر کے رنگ میں رنگا ہوا ہے-یہ ایک ایسا نوجوان ہے جس کے اندر اپنے کلچر سے بغاوت پائی جاتی ہے-ایک مسلمان ہونے کے ناطے اسے امرد پرستی اور مشت زنی کو ایک ناپسندیدہ فعل سمجھنا چاہیے-اپنے مذہب کے برخلاف وہ ان باتوں کی حمایت کرتا ہے-اپنے رسم و رواج کے خلاف بغاوت کرتا اور آزادانہ جنسی تعلقات کو درست سمجھتا ہے-

اس کے نظریات ایک ایسے شخص کے ہیں جو اپنی بیوی کے دوسرے مردوں کے ساتھ آزادانہ تعلقات کو درست سمجھتا ہے-یہ کردار ایک طوائف کو یہ کہہ کر شادی کی پیشکش کرتا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے بھی دوسرے مردوں سے تعلقات رکھے تو وہ ایک لبرل انسان ہے اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا-یورپ سے متاثر یہ کردار اس حد تک آزاد خیال شخص ہے جس کا ماننا یہ ہے کہ بغیر شادی کے بھی عورت بچے پیدا کر سکتی ہے، جس طرح سے جانور گابھن کیے جاتے ہیں عورت کے اندر بھی یہ بیج بویا جاسکتا ہے-اس کے نزدیک بچے پیدا کرنے کے لیے شادی

کی قطعاً ضرورت نہیں ہے عورت اس معاملے میں مکمل آزاد ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی شکست وریخت کی علامت یہ کردار اپنی ساری زندگی آسائشات میں گزارتا ہے۔گھر میں ہر سہولت کی چیز موجود ہوتی ہے۔عام آدمی کو جن بنیادی ضروریات کے لئے محنت مشقت کرنی پڑتی ہے،اس کا اندازہ ان میسر سہولیات کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔وہ ایک منافق شخص ہے جو محض غریبوں کے حقوق کی باتیں ہی کرتا ہے ان کی مدد کے لیے کبھی کوشش نہیں کی۔سڑکوں پر ٹائر جلا کر اور حکومتی املاک کو نقصان پہنچا کر وہ سمجھتا ہے کہ وہ عوام کی بہتری کے لیے کام کر رہا ہے۔

بقول فرزانہ سید

> ان کی کہانیوں کا تار وپود معاشرتی بنیادوں پر استوار ہے۔ان کی کہانیوں میں درجہ اول سوسائٹی کے چونچلے،ان کی منافقتیں،کھوکھلا پن،اور ریاکاری ہے۔۔۔۔۔[۲]

بیوروکریٹ طبقے سے تعلق رکھنے والا جنرل اور اس کے بیٹے کا کردار بھی معاشرے کے ایسے ہی دوغلے افراد ہیں جو منافقت بھری زندگیاں گزارتے ہوئے ملک وقوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ناول کی دوسری کہانی کا عنوان کاشف کی کہانی ہے۔بیس صفحات پر مشتمل اس مختصر کہانی میں پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی سماجی برائیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جدید پاکستانی معاشرے کے لوگوں کی سماجی زندگی میں ہر قسم کی اخلاقی اور مذہبی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔معاشرے کے کرداروں کے نفس میں خیر وشر کی جنگ چلتی رہتی ہے جس میں شر آخر کار خیر پر غلبہ پالیتا ہے۔معاشرے کے افراد مادی آسائشات کو قلبی سکون پر ترجیح دیتے ہیں۔اپنی معاشرتی اور اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال کر ذہنی طور پر پسماندہ معاشرے میں مادیت پرستی اس قدر عام ہو چکی ہے کہ وہ اپنی اصل سے ہٹ کر بے راہ روی کی راہ پر چلتے ہوئے مذہبی اقدار کو بھلا دیتے ہیں۔گناہ اور ثواب کی تفریق کیے بغیر جب کوئی معاشرہ وقت کی ضرورت سمجھ کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر غلط چیز کو اپنا لیتا ہے تو ایسا معاشرہ کھوکھلا ہو جاتا ہے۔

ناول میں ایک ایسا ہی کردار عام آدمی کا تخلیق کیا گیا ہے جو اپنی مادی خواہشات کے حصول کے لیے ہر غلط طریقہ کار اپناتا ہے۔مادیت پرستی نے انسان کو ہوس کا پجاری بنا دیا ہے۔اس کے سر پر پیسے کی دھن سوار ہے۔جس کے لیے وہ ہر ناجائز طریقہ اختیار کرنے سے چوکتا نہیں ہے۔یہ کردار ایک بیوہ اور اس کی جوان بیٹی کے ساتھ ناجائز تعلقات محض روپے پیسے کے لالچ میں آکر قائم کرتا ہے۔بیوہ کی دولت ہتھیانے کے بعد اس کا بے دردی سے قتل کر دیتا ہے۔

> ایک رات میں نے گلا دبا کے شگفتہ کو ختم کر دیا۔۔۔۔جب اس کا سانس اکھڑ رہا تھا'وہ کہے جا رہی

تھی۔۔۔۔مجھے چھوڑ کے نہ جانا عبدالرحمن۔۔۔۔مجھے چھوڑنا نہیں۔۔۔کوئی درندہ میرے اندر
تھا۔۔۔مقفل۔۔۔میں نے شگفتہ نائب تحصیلدار کی بیوہ کو مارا ہے۔۔۔میں نے زرینہ کو دغا
دیا۔۔۔میں میں۔۔۔قاتل بھی ہوں اور نوسر باز بھی۔۔۔[۷]

بیوہ اور یتیم کا مال ہڑپ کرنے اور ان کے اوپر ظلم کرنے کی مذہب اسلام اجازت نہیں دیتا۔اسلام بیوہ اور یتیم کے ساتھ صلہ رحمی کا رویہ روا رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔بیوہ کے نکاح کو پسندیدہ قرار دیتا ہے۔نامحرم کی صحبت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

ناول کا نسوانی کردار نائب تحصیلدار کی بیوہ اگر ایک نامحرم شخص کو اپنے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دیتی تو اس شخص کے فریب کے جال میں نہ پھنستی۔ناجائز جنسی تعلقات استوار کرنے کے بجائے نکاح جیسا پاکیزہ رشتہ قائم کرتی تو اس کا انجام اتنا برا نہیں ہوتا اور نہ ہی ایک غیر شخص سے سے دھوکہ کھاتی اور بے دردی سے قتل کی جاتی۔

عبدالرحمن ایک منافق شخص ہے جو ایک طرف تو بیوہ عورت کو جھوٹی محبت کا فریب دے کر اس کی دولت ہتھیانا چاہتا ہے اور دوسری طرف جھوٹ بول کر دھوکہ اور نوسر بازی سے وہ اس بیوہ کی بیٹی کو بھی جنسی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔قتل جیسا بڑا گناہ کرنے اور زنا کرنے کے بعد یہ کردار داخلی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔بیوہ کی دولت ہتھیانے کے بعد وہ اس کا استعمال نہیں کر سکتا اور اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔بانو قدسیہ نے یہ کہانی مادیت کی دوڑ میں بھاگتے ہوئے انسانوں کی بیان کی ہے۔مصنفہ سماج کے ان منفی رویوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن سے اخلاقی اقدار کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔بے حسی، فرد کی بے ضمیری اور خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ انسان کھوکھلے پن کا شکار ہو چکا ہے۔حصول زر کی خواہش میں انسان تمام اخلاقی و مذہبی حدود کو پار کر کے داخلی و خارجی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔

کاشف کی کہانی ایک ایسے پاکستانی معاشرے کو پیش کر رہی ہے جو قیام پاکستان کے بعد پاکستان حاصل کرنے کا اصل مقصد بھلا چکا ہے۔قائداعظم کے پاکستان بنانے کا مقصد یہی تھا کہ ایک ایسا اسلامی معاشرہ ہو جہاں مساوات ہو، ناانصافی نہ ہو، بے ضمیری نہ ہو۔مسلمان اپنے تمام دینی فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔قیام پاکستان کے بعد پروان چڑھنے والی نئی نسل بزرگوں کی قربانیوں کو فراموش کر کے ہر قسم کی سماجی و معاشرتی برائیوں میں مبتلا نظر آتی ہے۔انہیں پاکستان بغیر کسی بڑی قربانی کے مل گیا اور پاکستان کے لیے انہیں کوئی تگ ودو نہیں کرنی پڑی اس لیے اس نسل کو اس کی قدر و قیمت کا احساس نہیں۔

اس زوال پذیر معاشرے کی بنیاد مادیت پرستی پر رکھی گئی ہے۔ہر طرف مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔مادیت پرستی اس حد تک انسانی رگوں میں سرایت کر چکی ہے کہ انسان کو دولت کی ہوس نے بے ضمیر بنا دیا ہے۔ہر ناجائز

طریقے سے کمائی گئی دولت رزق حرام کے زمرے میں آتی ہے - دین اسلام میں رزق حرام کھانے کی سخت ممانعت ہے - ناجائز طریقے سے کمائی گئی دولت یا حاصل کیا گیا کوئی بھی مرتبہ انسان کو ہمیشہ اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے - جب انسان مذہبی اقدار کو بھلا کر گناہ اور ثواب کی تفریق کیے بغیر کوئی غلط راستہ اختیار کر کے کسی چیز کا حصول کرتا ہے تو اس کا نتیجہ ذہنی پراگندگی اور انتشار کی صورت میں سامنے آتا ہے -

کاشف کی کہانی میں بانو قدسیہ نے کوئی مخصوص طبقہ زیر بحث نہیں لایا بلکہ اس کہانی کا موضوع مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والا زوال آمادہ معاشرہ ہے - پولیس، سیاستدان اور اعلی افسران سے لے کر عام آدمی تک سبھی اپنی اپنی جگہ پر ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں - چھوٹی بڑی ہر سطح پر اور ہر شعبے میں دھاندلی ہو رہی ہے - ہر فرد اپنی اپنی جگہ معاشرے کو تباہ و برباد کرنے پر تلا بیٹھا ہے - اقتدار، دولت، شہرت حاصل کرنے کی چاہ میں نام نہاد اجارہ دار طبقہ غلط کاموں میں ملوث نظر آتا ہے - ناول میں بانو قدسیہ نے ایک ایسا ہی معاشرہ دکھایا ہے جہاں ناانصافیاں اپنے پورے زوروں پر ہیں - قانون عوام کا رکھوالا بننے کے بجائے سیاستدانوں کے ساتھ مل کر دھاندلی کروانے میں مصروف عمل نظر آتا ہے -

بانو قدسیہ معاشرے میں پنپنے والی سماجی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے معاشرے میں عام ہوتی ہوئی ایک سماجی برائی رشوت کا ذکر کرتی ہیں - تمام شعبوں میں رشوت دے کر ہر ناجائز کام کروایا جاتا ہے - پولیس کا شعبہ رشوت کے لئے بدنام ہے - پولیس والے رشوت لے کر ہر ناجائز کام کرتے ہیں چاہے اس سے ملک و قوم کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو - سیاست دان اپنی سیاست کو تقویت پہنچانے کے لیے الیکشن میں دھاندلی کرواتے ہیں اور پولیس کا کام اس دھاندلی کو روکنا ہے جبکہ پولیس کا کردار اپنے فرائض کے برعکس نظر آتا ہے - پولیس کا شعبہ اپنے فرائض ادا کرنے کے بجائے رشوت لے کر سیاستدانوں کے ساتھ مل کر دھاندلی کروانے میں پیش پیش ہوتا ہے -

> آپ کے علاقے میں آپ کی نگرانی تلے ووٹ ڈالے جائیں گے - آپ کا کام ہے ان دس بارہ دنوں میں ان کو ہراساں کر دیں - پولیس کا ان کے گھر میں پھیرا ٹورا ہونا چاہیے..... ووٹ بہر کیف حبیب صاحب کو نہیں پڑھنے چاہیں..
>
> لیکن سر یہ تو دھاندلی ہے --- ووٹ ہر شہری کا حق ہے 'اسے آزادانہ استعمال کرنے کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا ---
>
> جو اوپر سے آرڈر آ رہے ہیں اس کی تعمیل کریں - باقی آپ کون ہیں؟ آپ کا ضمیر کیا کہتا ہے 'کیا ٹھیک ہے 'غلط ہے اس کی پرواہ نہ کریں ---[5]

بانو قدسیہ کا یہ ناول ان کے عہد کے سماجی و معاشرتی مسائل کی واضح تصویر ہے - وہ تمام سماجی حقائق کو اس

ناول میں بڑی باریک بینی کے ساتھ بیان کرتی ہیں-اگر کوئی باشعور شخص رشوت لینے سے انکار کر دے تو اعلیٰ حکام اس کا جینا مشکل کر دیتے ہیں-ناول کا ایک ایسا ہی کردار جو اعلی تعلیم یافتہ اور باشعور ہونے کے باوجود پاکستانی معاشرے میں کھوکھلے نظام کی وجہ سے دلبرداشتہ ہو کر ملک بدر ہو جاتا ہے-اس کردار کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ دھاندلی کروانے میں سیاستدانوں کا ساتھ دے-

سیاستدان اقتدار حاصل کرنے کے لئے طاقت کا غلط استعمال کرتے ہیں-پولیس کو رشوت دے کر عوام کو ووٹ دینے کے بنیادی حق سے محروم کرتے ہیں-یہ کردار ایس ایچ او ہونے کے باوجود سیاست دانوں کی طاقت سے خائف ہے-ان کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکتا-ایسے معاشرے میں ایک عام آدمی کی کیا حیثیت ہو گی جہاں پولیس کا افسر اپنی طاقت رکھنے کے باوجود بھی رشوت لینے سے انکار نہیں کر سکتا-اس کردار کے ذریعے سے مصنفہ نے معاشرے کی اخلاقی کمزوریوں کو اجاگر کیا ہے-معاشرے کے ان نام نہاد اجارہ داروں سے ٹکر لینے کی ہمت کوئی نہیں کرتا-ڈٹ کر حالات سے مقابلہ کرنے کے بجائے یہ کردار ملک سے فرار ہونا زیادہ بہتر سمجھتا ہے-ان حالات میں وہ ملکی مفاد کو نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کو ملک و قوم پر ترجیح دیتا ہے-

بر سر اقتدار طبقہ دولت کے بل بوتے پر اقتدار کے نشے میں مست انسانی قدروں اور معاشرتی اصولوں کو توڑ کر اپنا مقصد حاصل کر رہا ہے-بعض باضمیر لوگ جو ان غلط کاموں میں ملوث نہیں ہونا چاہتے ان کو بھی ان کی مرضی کے خلاف احکامات دیئے جاتے ہیں-ان احکامات پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں انہیں تباہ و برباد کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں-ایس ایچ او کا کردار رشوت لینے اور دھاندلی کروانے سے انکار کرتا ہے تو اس کے افسران اسے اس کام پر مجبور کرتے ہیں-یہ ایک دیانت دار شخص ہے جب اعلی افسران اسے غلط کاموں کے لیے مجبور کرتے ہیں تو وہ داخلی کرب کا شکار ہو جاتا ہے-

معاشرے میں پھیلی ان سماجی ناانصافیوں منافقانہ رویوں اور برائیوں کی وجہ سے معاشرتی ڈھانچہ متزلزل ہو کر رہ گیا ہے-ان کی وجہ سے کوکھلی اقدار پروان چڑھ رہی ہیں-بظاہر مذہبی لوگ بھی ان معاشرتی برائیوں میں ملوث ہیں-ناول کا ایک کردار جو ایس پی کے عہدے پر فائز ہے-نمازی لیکن جاگیرداروں کے کہنے پر ان سے رشوت لے کر منافقانہ رویہ اپناتا ہے-اپنے ماتحت پولیس افسران کو دھاندلی کرنے پر مجبور کرتا ہے-

بانو قدسیہ نے ناول کے پہلے حصے شـــــہر لازوال میں جس باریک بینی سے معاشرتی و سماجی برائیوں کو بیان کیا ہے وہ ان کے گہرے انسانی مطالعے و مشاہدے کا ثبوت ہے-جدید پاکستانی معاشرے میں اپنے مذہبی و معاشرتی اقدار و روایات سے بغاوت کرتے ہوئے غیر عورتوں سے جنسی تعلقات استوار کیے جا رہے ہیں-پدرسری نظام میں

عورتیں اپنے معاشرتی رسم ورواج سے بغاوت کرتے ہوئے ہوئے مرد کو ذلیل ورسوا کر رہی ہیں۔جاگیردارانہ نظام میں مزارعوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔برسراقتدار طبقہ طاقت کے نشے میں چور عوام کے حقوق کا استحصال کر رہا ہے۔

مرد عورت کو صرف استعمال کی چیز سمجھتا ہے۔عورتیں اپنے بڑھاپے میں تنہا رہ جانے کے خوف میں مبتلا ہیں۔خواتین کے ازدواجی تعلقات محض مصلحت پسندی پر ٹکے ہوئے ہیں۔شوہر کو دوسری عورتوں کی تحویل میں دیکھ کر بھی خواتین واویلا نہیں مچاتی۔خونی رشتوں کا تقدس پامال کیا جارہا ہے اپنے سگے خونی رشتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور رشتوں سے اعتماد ختم ہو چکا ہے۔نوجوان نسل اپنے مذہب اور کلچر سے دور بغاوت پر تلی ہوئی ہے۔جنسی بے راہ روی کا شکار معاشرہ گناہوں میں ملوث ہو کر نفسیاتی مسائل کا شکار نظر آتا ہے۔

عفت افضل بانو قدسیہ کی کہانیوں کے موضوعات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> بانو قدسیہ نے طبقاتی کشمکش، معاشرتی رسوم ورواج، نوجوان نسل کی بے راہ روی اور ان کے ذہنی مسائل محبت، جنس، عورت کا احساس محرومی، ان کا عدم تحفظ کا احساس، خوف اور ازدواجی تعلقات اور رشتوں جیسے اہم موضوعات کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔یہ تمام ایسے موضوعات ہیں، جن کا ہماری زندگی اور معاشرے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔[9]

ناول کی کہانی میں برصغیر پاک وہند کی پہلی جنگ جو آزادی کی خاطر برصغیر کی عوام نے انگریزوں کے خلاف لڑی جنگ آزادی ہند ۱۸۵۷ء کہلاتی ہے۔اس جنگ میں ہندوستان کی مقامی آبادی کے ساتھ جو ظلم وزیادتی ہوئی بانو قدسیہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ناول کے ایک مسلم کردار کے ہاں تاریخ کی بازیافت ملتی ہے۔یہ کردار جنگ آزادی کے وقت اپنی تمام جائیداد کھو بیٹھتا ہے۔حکومت اس کی تمام جائیداد جنگ آزادی کے بعد سلب کر لیتی ہے۔

ناول میں بانو قدسیہ نے ایک گیت کے ذریعے جنگ آزادی کے بعد کے حالات کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> چار ٹکے پر نوکر رکھ کر دین ایمان مٹا دیں
> دانتوں سے کہ توس توڑا دیں۔چربی سور کھلا دیں
> چار ٹکے پر نوکر رکھ کہ دین ایمان اڑا دیں
> بن گئے شاہ فرنگی بھائی دیکھو وقت کی بلیاری
> محلوں کی رہنے والی پھریں ہزار پجاری
> گورے بندر تن تن کے شہزادوں کو نچا دیں
> چار ٹکے پر نوکر رکھ کر دین ایمان مٹا دیں [10]

اس جنگ میں مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور جنگ کے بعد ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج ہو گیا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی جائیدادیں سلب کر لیں مسلمان کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔اس جنگ کے بعد مسلمان ہی سب سے زیادہ انگریزوں کے زیر عتاب آئے کیونکہ ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت اختیار کر لی تھی۔ دیسی سپاہیوں کو انگریز زبردستی اس کارتوس کے استعمال پر مجبور کرتے تھے جسے بندوقوں میں ڈالنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا چونکہ کارتوس میں سور اور گائے کی چربی استعمال کی گئی تھی یہ بات ہندووں اور مسلمانوں کے مذہب کے خلاف تھی۔سپاہیوں نے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور مزاحمت کرنے والے سپاہیوں کو سخت سزا دے کر انگریز قید میں ڈال دیتے۔

اس جنگ میں انگریزوں نے عوام کو تو بے دریغ قتل کیا ہی مغل سلطنت کے شہزادوں کے سر کاٹ دیے آخری مغل بادشاہ کو جیل میں ڈال کر ہندوستان پر انگریزوں نے اپنی حکومت جمالی۔جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کی جائیدادوں کو زبردستی ہڑپ کر لیا تھا۔جنگ آزادی کے بعد اعلی حسب نسب والے صاحب جائیداد مسلمان پائی پائی کے محتاج ہو گئے۔اس گیت کے ذریعے سے مصنفہ نے جنگ آزادی کے وقت سیاسی حالات کیسے تھے؟ مغلوں کو کیا مشکلات درپیش آئیں؟ایک عام آدمی کو کیا جھیلنا پڑا؟ان تمام سیاسی حالات کا بیان اس گیت کے ذریعے ملتا ہے۔

ناول کے دوسرے حصے آباد ویرانے میں بانو قدسیہ نے تاریخی تناظر کے اعتبار سے وہ زمانہ دکھایا ہے جب بیسویں صدی میں برصغیر پاک وہند میں سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔بیسویں صدی انقلابات زمانہ کی صدی تھی اس دور میں برصغیر پاک وہند میں برصغیر کی تقسیم کا انقلاب آیا۔اس کٹھن دور میں مسلمانوں کو مل جل کر حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا اپنے کلچر کو فروغ دینا چاہیے تھا اس کے برعکس اس عہد کے مسلمان اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ٹکڑوں میں بٹ گئے۔اپنی مسلم اقدار و روایات کا خود گلا گھونٹ دیا۔بانو قدسیہ نے مسلم معاشرے کی قدروں کے ٹوٹنے کی بازگشت مسلمانوں کا اپنی شناخت کھو دینے اور تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہونا دکھایا ہے۔

> ہندوستان کے مسلمانوں کی اس عہد میں عجیب حالت تھی۔مسلمان بہت سے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔کانگریسی مسلمان'نیشنلسٹ مسلمان'حکومت کے طرف دار مسلمان'انگریز حکومت کے خلاف مسلمان'نہرو رپورٹ کے حامی'نہرو رپوٹ کے مخالف مسلمان'خلافت تحریک کے عاشق'اس تحریک سے بیزار'علماء کے عاشقین اور اہل دین کے مخالف'مذہب کو واحد رستہ نجات سمجھنے والے اور دین کو ترقی کے راستے کی سب سے بڑی دیوار ماننے والے'مغرب زدہ مسلمان اور مشرق پر جان چھڑکنے

والے۔۔۔ مسلمان گروہی حالت میں تھے.....۔[11]

بانو قدسیہ نے مسلم معاشرے کے اندر پائی جانے والی ٹوٹ پھوٹ اور عدم اتحاد کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مسلمان اپنے مذہب اور کلچر کو فروغ دینے کے بجائے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جہاں اپنا مفاد دیکھتے حالات کے مطابق مصلحت پسندی اختیار کر لیتے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے نظریات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی مسلم معاشرہ اپنے الگ الگ نظریات رکھتا ہے۔ جس جماعت کے ساتھ اپنا ذاتی فائدہ دیکھتے اسی کے ساتھ منسلک ہو جاتے۔ مسلمانوں کے اندر اتحاد کا فقدان نظر آتا ہے کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے بجائے انتشار کا شکار تھے۔ مسلمانوں کے اندر عدم اتحاد نے ان کو تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا کر دیا تھا۔ مسلمان قوم اپنے ہی ہاتھوں اپنی تہذیبی و ثقافتی قدروں کو شکست وریخت کا نشانہ بنا رہی ہے۔

صفیہ عباد کا اس بارے میں کہنا ہے:

> عصری انتشار اور سیاسی بدامنی سے یہ قدریں اب زوال پذیر ہیں۔ ان کی زوال پذیری در حقیقت ہماری ہی زوال پذیری ہے اس کے باعث باہمی انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں بھروسہ، اتفاق، پہچان سب اس کی زد میں آکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ [12]

برصغیر پاک وہند کے مشترکہ تہذیبی معاشرے میں سیاسی تبدیلیوں اور انتشار نے تہذیبی قدروں کو نقصان پہنچایا ہے اور ان زوال پذیر تہذیبی قدروں نے باہمی رشتوں کو بھی بری طرح پامال کیا ہے۔

برصغیر پاک وہند کے مشترکہ معاشرے میں ہندو مسلم صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے ان میں اخذ و انجذاب ہونا ایک فطری عمل تھا۔ ناول کی کہانی میں مسلم کرداروں پر انگریزی تہذیب اور ہندی تہذیب کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ ناول کا ایک مسلم کردار جب انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس لوٹتا ہے اس کے ذہن پر انگریزی تہذیب کے انمٹ اثرات ہوتے ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے یہ کردار صفائی کو اپنی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے عزیز نہیں رکھتا بلکہ انگریزی تہذیب و معاشرت میں صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے انگلستان میں انگریزی تہذیب میں چھ سال بسر کرتے ہوئے وہ صفائی کو ایمان کا حصہ سمجھ کر نہیں بلکہ انگریزی تہذیب کا حصہ سمجھ کر صفائی کو عزیز رکھتا ہے۔ انگریزی تہذیب کے مطابق اپنے بچوں کی سالگرہ مناتا ہے۔ وہ ایک مسلم کردار ہے اور مسلمانوں کے ہاں سالگرہ منانے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

یہ کردار مسلم روایات سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں رکھتا۔ دین سے دوری کے باعث وہ اپنے والد کا بھی احترام نہیں کرتا۔ دین اسلام میں والدین کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ والدین سے حسن سلوک کرنا اولاد پر فرض ہے۔ وہ اپنے والد سے لڑ

جھگڑ کر اسلامی تہذیب کے بجائے ہندو تہذیب کو زیادہ فوقیت دیتا ہے-ہندو قوم سے دوستی رکھتا اور روابط بڑھاتا ہے جبکہ مذہب اسلام میں غیر مذہبوں سے دوستی سے منع کیا گیا ہے-یہ کردار انگریزوں جیسے طور اطوار اپنائے ہوئے ہے-لباس بھی انگریزی تہذیب کے مطابق پہنتا ہے-انگریزوں کی تقلید میں گھر میں بھی انگریزی طرز کا تھری پیس سوٹ زیب تن کرتا ہے-اپنا سارا وقت کلب میں دوستوں کے ساتھ گزارتا ہے-مسلمانوں کی بڑی جماعت مسلم لیگ کا ساتھ دینے کے بجائے کانگریس میں شمولیت اختیار کیے ہوئے یہ کردار مسلمانوں کے اخبار تک پڑھنا پسند نہیں کرتا-وہ ہندی اخبار پرتاپ کا مطالعہ کر کے ہندوؤں کے نقطہ نظر کے مطابق ہندوؤں کی حمایت کرتا-یہ مسلم کردار اس حد تک لبرل ہے کہ اپنی مسلم تہذیب کو فراموش کر بیٹھا ہے-دوسری تہذیبوں کو تقویت پہنچاتا اور اپنی تہذیب کو نقصان پہنچاتا ہے-

> عباس منزل میں بھی کچھ مذہب کی پابندی سے نئی نسل سے بگاڑ نہ تھا....وہ تو عیدین کی نماز پڑھنے بھی مسجد میں نہ جاتے تھے... میاں عباس پکے کانگریسی تھے-ان کے نزدیک برصغیر کے تمام مسائل کا حل کانگریس کی مٹھی میں تھا-ایک مدت انہوں نے کھدر کا کرتا' پاجامہ اور سر پر نہرو کیپ پہنی تھی۔ [۱۳]

ناول کے مسلم کردار مغرب سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے مذہب کو مکمل طور پر بھلا چکے تھے-خود بھی اپنے کلچر سے بچھڑ رہے ہیں اور ان کی نسل بھی اپنے کلچر سے دور ہو رہی تھی لیکن والدین کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ والدین خود بھی اپنے مذہب اور کلچر سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے-

ناول میں مسلم تہذیب کے بچے جو کم عمری سے ہی ایک ہندو اکثریت والے علاقے میں رہائش پذیر تھے ان کا سارا وقت ہندو آبادی کے ساتھ گزرتا اسکول میں بھی اہل ہنود کے ساتھ پڑھتے پڑوس میں بھی ہندو بچوں کے گھر میں ہر وقت گھسے رہتے-ہندو معاشرے میں رہتے ہوئے بچے کھیل بھی ہندی تہذیب کے ہی کھیلتے-کھیلوں میں بھی اپنی اسلامی تہذیب کا کوئی واقعہ یا تاریخ کو بیان کرنے کے بجائے ہندو پنڈتوں کا کردار ادا کرتے-

> شوکت نے ماتھے پر صندل کا ٹھیکا' لمبا کرتا' ہاتھ میں مالا' پیروں میں کھڑاویں' شوکت کو لکشمی پوجا کرنے والے پنڈت جی کا روپ دھارنا تھا۔۔۔شوکت کو ڈر تھا کہ کہیں دیوٹ بجھ گئے تو مندر کا سین خراب ہو جائے گا۔۔۔ سٹیج کے دونوں پردوں میں سے گردن بھر نکال کر کہا۔۔۔حاضرین ہم نے یہ ڈرامہ خود لکھا ہے-اس کا نام ہے چوروں کو پڑ گئے مور....اس ڈرامے میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک چور لڑکی اغوا کر کے لاتا ہے اور پنڈت جی اسے راہ راست پر لاتے ہیں- [۱۴]

یہ کردار اپنے طور اطوار اور ملنے جلنے کے آداب میں ہندو تہذیب کو اپنائے ہوئے ہے۔اس کی زبان پر بھی ہندی تہذیب کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

موسی کرشنا پالاگن [15]

آوشیا آؤنگا چندر بالکا [16]

مسلم کرداروں کے ہاں ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت کے قصے ملتے ہیں۔

ماسی کرشنا میں جانتا ہوں۔۔۔بوآپ کے جیون کا کیندر ہے اور آپ اسی کے دھیان میں رہتی ہیں۔ لیکن ایسی مہلا جو مرلی دھر کے شرن میں اپنا سب کچھ دان کر چکی ہوں اسے چنتا کیوں۔شاستروں میں تو آیا ہے کہ آپ ایسی پتی برتا شبھ چنتک سویم سویکا استری سے تو مہادیو بھی ڈرتے ہیں۔پھر یہ اشانتی کیوں؟ [17]

ابتدا میں مسلمان ہندوستان آئے تو مفتوحین کی حیثیت سے آئے۔مفتوح قوم غالب ہوتی ہے اور اس کی تہذیب و ثقافت بھی غلبہ پاتی ہے۔پہلے پہل تو مسلمان مفتوحین کی حیثیت سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر اثرانداز ہوئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہندی تہذیب اپنانے لگے۔یہ ایک فطری عمل ہے جب زیادہ دیر تک دوسری تہذیبوں کی حامل اقوام کے ساتھ رہا جائے تو خود بخود ہی ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے ان کا کلچر دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔یہی حال مسلمانوں کا ہوا وہ بھی دیگر تہذیبوں سے متاثر ہونے لگے ان کا رہن سہن، لباس، زبان حتیٰ کہ مذہبی لحاظ سے بھی وہ دوسری تہذیبوں کو اپنانے لگے۔

ناول میں مصنفہ نے مخلوط معاشرے میں رہتے ہوئے مسلم خواتین پر بھی اس معاشرے کے اثرات ہوتے اور ان اثرات کو قبول کرتے ہوئے دکھایا ہے۔مسلم خواتین ہندی معاشرے میں رہتے ہوئے اس تہذیب کے مطابق لباس بھی ہندوانہ پہنتی اور ان کے طور اطوار ملنے جلنے کے آداب بھی ہندی تہذیب کے مطابق ہیں۔جب کسی سے ملتی ہیں تو اپنی اسلامی تہذیب کے مطابق اسلام علیکم کہنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر ملتی ہیں۔توہم پرستی بدشگونی پر یقین رکھتی ہیں۔نمود و نمائش کو پسند کرتی ہیں اور اپنے بچوں کی شادیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق سادگی سے کرنے کے بجائے نمود و نمائش کے لیے ہزاروں جتن کرتی ہیں۔

مذہب اسلام میں شادی سادگی کے ساتھ کرنے کا حکم ہے جب کہ مسلم نسوانی کردار ہندی معاشرے کے زیر اثر شادی کو ایک فریضہ سمجھنے کے بجائے جہیز اکٹھا کرنے نمود و نمائش کرنے اور ہندوؤں کی شادی کی رسومات ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ناول کی کہانی میں مسلم خواتین ہندوؤں کی سنگت میں بندی لگاتی ساڑھیاں پہنتی اور مندروں میں

جاتی ہیں۔

اس کا حلیہ دیکھ لو ساجدہ بی بی.... ماتھے پر یہ بندی.... تن پر یہ ساڑھی.... تمہاری آزادی نے یہ دن دکھائے..... کب سے کہہ رہا ہوں اسے اتنی آزادی نہ دو.... آج ماتھے پر تلک لگایا ہے کل کو دیئے جلا کر مندر جانے لگی... میل جول ہی ساری چیز ہے۔ [۱۸]

ہندی معاشرے میں رہتے ہوئے یہ کردار اس تہذیب سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے۔ مسلم خواتین اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اپنے شوہر کے مرنے کے بعد عقد ثانی کرنے کے بجائے ہندی تہذیب کے زیر اثر ساری زندگی اپنے شوہر کے نام پر گزار دیتی ہیں۔ اسلام میں بیوہ کا نکاح جائز ہے۔ ہندو مذہب میں بیوہ یا تو شوہر کی لاش کے ساتھ جل کر ستی ہو جاتی ہے یا اپنی ساری زندگی شوہر کے نام پر گزار دیتی ہے۔ ہندو مذہب میں عورت کی دوسری شادی کو احسن نہیں سمجھا جاتا۔ ہندی تہذیب میں رہتے ہوئے مسلم خواتین کے ذہنوں پر بھی دوسری شادی کے بارے میں یہی خیالات ہوتے ہیں۔ مسلم خواتین ساڑھی پہنتی ماتھے پر بندی بھی لگاتی اور ہندوؤں کے مذہبی تہوار کرواچوتھ پر ہندو عورتوں کی طرح مانگ میں سیندور بھر لیتی۔

کوئی بھی قوم چاہے وہ ہندو ہو یا مسلم جب ایک مخلوط معاشرے میں زیادہ عرصہ رہے تو اس کا کلچر خالص نہیں رہتا۔ دوسری تہذیبوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے کلچر میں تبدیلیاں نامعلوم طریقے سے سرایت کر جاتی ہیں۔ کوئی بھی کلچر صرف اس وقت تک ہی خالص رہ سکتا ہے جب کوئی قوم کسی مخصوص جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے دوسری قوموں کے اثرات سے محفوظ رہے۔ مختلف اقوام کے ساتھ زیادہ عرصے تک رہنے کی وجہ سے ایک قوم نا محسوس طریقے سے دوسری قوم کا کلچر اپنا لیتی ہے۔

ہندو قوم بھی صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کا کلچر بڑی حد تک اپنائے ہوئے تھی۔ مسلم اور ہندی تہذیب میں میل جول آٹھویں صدی سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے رسم و رواج، معاشرت، رہن سہن، عادات و اطوار ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں یگانگت نظر آتی ہے مسلمانوں اور ہندوؤں نے ہزار ہا برس ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہے۔

ناول کے ہندو کردار ملنے جلنے کے آداب میں مسلم تہذیب کو اپنائے ہوئے تھے جب ملتے تو آداب کہہ کر ملتے۔ لبرل ہندو تھے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی گوشت بھی کھا لیتے تھے جب کہ ہندو مذہب میں ماس کھانے کی اجازت

نہیں تھی- کٹر ہندو اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے- ہندو خواتین ہندی زبان بولنے کے بجائے اردو زبان بولتی ہندو لڑکی کا مکالمہ ملاحظہ کیجئے: اس مکالمے میں اس کی زبان پر اردو زبان کے واضح اثرات نظر آتے ہیں-

اوما لڑکی کی سیل سے بندر یا سی اتری.... کونسی تاریخ ہے---- تسنیم باجی---

جناب تسنیم آپا اگر میں برما چلی گئی تو-----

لے بس میرا بیاہ ہوا ہی سمجھ----

پکی بات-----اوما نے ہاتھ بڑھایا---

لو جی---آپ تو چھپی رستم نکلیں--- بھلا کون ہے وہ ایسا خوش نصیب کون ہے وہ شہزادہ؟

نام---پورا نام بتایئے فوجی ہے کہ ڈاکٹر---وکیل ہے کہ بزنس مین---اوما نے پوچھا---

اوما نے کھینچ کر دوپٹہ علیحدہ کیا اور گدگدی کرتے ہوئے بولی---"بتائیں جی بتائیں" اب اور نہ ستائیں----

تسنیم نے اوما کے ہاتھ پرے کر کے ہنستے ہوئے کہا---ابھی بتاتی ہوں ابھی---ابھی تو ہاتھ تو پرے کر----ناں

لیجیے پرے ہو گئے ہاتھ 'فورا بتائیں نام پتہ عمر---پیشہ سب کچھ.... [19]

یہ ہندو نسوانی کردار اپنی زبان میں بھی اور لباس میں بھی مسلم تہذیب کو اپنائے ہوئے تھا-اوما مسلم تہذیب کے مطابق حلیہ اختیار کرتی کانوں کے قریب دو چوٹیاں بناتی مسلم لڑکیوں کی طرح شلوار فراک پہنتی اور دوپٹہ اوڑھتی-

کسی بھی معاشرے میں جب دو مختلف تہذیبوں کے حامل افراد اکٹھے رہتے ہیں تو ایسے معاشرے میں اخذ و انجذاب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے- تہذیبیں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ لیتی اور دیتی رہتی ہیں- مسلمان اور ہندو برصغیر پاک و ہند میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے تھے اور اپنی تہذیب و ثقافت کا کچھ حصہ دیا بھی اور لیا بھی- جب زیادہ عرصہ تک دو مختلف تہذیبوں کی حامل اقوام اکٹھی رہتی ہیں تو ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی ہیں- یہی حال ہندی تہذیب اور مسلم تہذیب کا ہوا- برصغیر پاک و ہند میں کئی صدیوں سے ہندو اور مسلمان پڑوسیوں کی طرح اکٹھے رہ رہے تھے دونوں اقوام کے لوگ ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ گئے- اس طریقے سے نہ ہی اسلامی تہذیب خالص رہ سکی اور نہ ہی ہندی تہذیب-

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی اقوام ایک دوسرے سے مذہبی تعصب روا رکھتی ہیں- ناول کی کہانی میں بھی جا بجا مذہبی تعصب ہندو اور مسلم کرداروں میں نظر آتا ہے- مسلم کردار ہندو

قوم سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اور ہندوؤں کو اپنے کلچر کے لیے بہت بڑا خطرہ شمار کرتے ہیں۔ہندوؤں کے لباس اور مذہبی عقیدت کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ناول کے ایک مسلم کردار میں مذہبی تعصب ملاحظہ کیجئے:

کیسا دیس ہے؟.... کیسی نگری ہے۔کسی کلمہ گو کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔صبح و شام وہی ٹھاکر چندر سین.... وہی دھوتیاں' وہی رام رام....۔لاحول ولا....

ٹھاکر چندر سین کا گھرانہ....ایک پتھر اٹھاؤ تو دس سنپو لیے نکلتے ہیں۔۔[۲۰]

مسلم کردار اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ میل جول رکھنا پسند کرتے ہیں۔ہندو اکثریت والے علاقے میں رہتے ہوئے ہر وقت ہندوؤں کے ساتھ آمنا سامنا مسلمانوں کو ذہنی کوفت میں مبتلا کرتا ہے۔مسلمان ہندوؤں کا اپنے گھر میں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ہندووں کے ساتھ میل جول کو اپنے دین کے لئے خطرہ محسوس کرتے ہیں۔اپنی اولاد کو بھی ہندوؤں کے ساتھ دوستی رکھنے سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ناول کی کہانی میں ہندو خواتین کے ہاں مسلمانوں کے لیے شدید مذہبی تعصب دیکھنے کو ملتا ہے۔اگر ان کے گھروں میں پڑوس سے کوئی مسلم آجاتا تو اسے اپنے باورچی خانے میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔اگر کھانے کی کوئی چیز دیتیں تو اپنے برتنوں میں دینے کے بجائے پتوں پر رکھ کر دیتیں۔ہندو خواتین اپنے مذہبی نظریات میں بہت زیادہ کٹر ہوتی ہیں۔

گائتری ماتا جی نے ساری عمر ٹھاکر چندر سین کو نہ کبھی جواب دیا نہ ہی گستاخی کی لیکن باورچی خانے کی پوترتا کا مسئلہ تھا ایک روز پھٹ پڑیں.... ٹھاکر جی! اب آپ کے یہ ڈاکٹر صاحب تو کچھ سمجھتے نہیں۔ان کی بیوی میرے پاس پیڑھی گھسیٹ کر آ بیٹھتی ہیں اور ترکیبیں پوچھتی ہیں۔بھلا ان کو کوئی کیسے سمجھائے کہ میرا دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔وہ ٹھہری مسلمان ملیچھ....ان کے جانے کے بعد مجھے گؤ ماتا کا پیشاب ڈھونڈنا پڑتا ہے۔پھر ساری رسوئی کا فرش دھو کر پیشاب سے اشنان کرانا پڑتا ہے....آپ انہیں جیسے کیسے سمجھا دیں کہ ایسے نہیں چلے گا۔کسی کی رسوائی میں کیوں گھسی رہتی ہیں۔۔[۲۱]

ہندو مسلم صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے۔ملکی حالات خراب ہونے کی وجہ سے ایک ہندو لڑکی کو مسلمان گھرانے میں رہنا پڑتا ہے۔اس کے والدین اسے سختی سے منع کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کھانا پینا نہیں ہے۔یہ کردار اپنا کھانا پینا الگ رسوئی میں خود پکاتی اور اپنے برتن بھی علیحدہ رکھتی ہے۔ہندو ملازم سے اپنے لئے الگ کھانے پینے کا سامان منگواتی ہے۔والدین اسے سختی سے منع کرتے ہیں کہ مسلم خاندان کے ساتھ رہتے ہوئے ماس نہیں کھانا اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان گھرانے میں جانا ہے۔مسلمان گھرانے میں ان کے برتنوں میں کھانا کھانے سے ہندوؤں کے نزدیک ان کا مذہب بھرشٹ ہو جاتا ہے۔کسی مجبوری کی وجہ سے کسی مسلمان گھرانے میں جانا پڑ بھی جائے

تو ان کے گھر کھانے پینے کی بچوں کو بھی اجازت نہیں تھی--ہندو بچوں کو بچپن سے ہی یہ سکھایا جاتا کہ مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے سے انسان بھرشٹ ہو جاتا ہے-

پاشی بہن جی یہ بھی تو کہتی ہیں کہ مسلمان ملیچھ ہیں اور ان کے ساتھ ملنے جلنے والا بھرشٹ ہو جاتا ہے---[۲۲]

دنیا میں ہر مذہب کے لوگ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مذہبی تعصب رکھتے ہیں-ہندو مسلم برصغیر پاک وہند میں صدیوں سے اکٹھے رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے شدید مذہبی تعصب رکھتے تھے اور اپنے مذہب کو ہی بہترین جبکہ دوسرے مذہب کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتے تھے-ناول کی کہانی میں ہندو اور مسلم خاندان کی تیسری پشت تک دوستی چلی آرہی تھی-ایک دوسرے کے گھرانوں میں بے تکلفی کے ساتھ آنا جانا تھا اس کے باوجود ہندو اور مسلم کرداروں کے ہاں شدید مذہبی تعصب دیکھنے کو ملتا ہے-

مسلم کرداروں کو اس بات کا شدید احساس دلایا جاتا تھا کہ ہندو اپنی رسوئی میں ان کا داخلہ پسند نہیں کرتے-ہندوؤں کے ان لکھے قانون کے مطابق کوئی بھی مسلمان ان کی رسوئی میں داخل نہیں ہو سکتا-اگر غلطی سے کوئی مسلمان ان کے باورچی خانے میں داخل ہو بھی جائے تو ہندو سمجھتے کہ ان کا باورچی خانہ ناپاک ہو چکا ہے-گائے کے پیشاب کے چھینٹے اڑا کر باورچی خانے کو دھوتے اور اسے پاک کرتے-جو ہندو گھرانے مسلمانوں سے میل جول رکھتے ان کو بھی برا بھلا کہا جاتا-مسلمانوں کو نفرت کی بنا پر کٹڑ ہندو مسلا کہہ کر بلاتے-مسلمانوں کو حملہ آور کہتے-ان کا خیال تھا کہ برصغیر پاک وہند پر صرف ہندوؤں کا ہی حق ہے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ برصغیر چھوڑ کر چلے جائیں-ناول کے ہندو کردار کے ہاں یہ نظریات ملتے ہیں-

ان مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر ہمارا دھرم نشٹ کر دیا ہے-وہی دن بھلے تھے جب شودر سال بھر میں ایک بار حجامت بناتا-ساری عمر برہمن کا جھوٹا کھاتا تھا---جو کبھی اونچی جاتی والے کے ساتھ زبان لڑاتا تو زبان میں سوراخ کر دیا جاتا-دھرم کی باتیں شودروں کو کوئی سکھا نہ سکتا تھا-بھنگی' چمار' کنجڑ' دھنکار' ڈوم چنڑال بدھا تو سب گاؤں سے پرے رہتے تھے---تمبولی' کوری کرمی کاچھی رہے تو گاؤں میں پر دور دور---ان ملیچھ مسلمانوں نے آن کر انہیں اپنی جگہ ہی بھلا دی ہے-انگریزوں اور مسلمانوں کو تو چھوڑیئے ماتا جی وہ تو ہیں ہی حملہ آور---ہمارے لئے تو مسلمان شودر سے بھی ملیچھ ہیں- بھلا جو گائے ماتا کا ماس کھائیں' وہ ہم میں سے کیسے کہلائیں---اتنا کافی نہیں کہ انگریز جائیں---بھلے یہ مسلمان بھی سدھاریں غزنی جائیں یا بخارا-ہم گنگا جل سے اپنی دھرتی پوتر کریں گے-[۲۳]

ہندو اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جاتا- مسلمانوں کو کنویں سے پانی بھرنے کی بھی اجازت نہیں تھی- کسی مسلمان کے اندر یہ جرات نہیں تھی کہ کنویں سے اپنی ضرورت کے لیے پانی بھر سکے- متعصب ہندو نیچی ذات والوں کو اور مسلمانوں کو کنویں کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتے تھے- اونچی ذات والے جب کسی جگہ سے گزر رہے ہوتے تو مسلمان اور نیچی ذات والے انہیں راستہ دیتے اور راستہ چھوڑ کر اس وقت کھڑے رہتے جب تک اونچی ذات والا ہندو گزر نہ جائے-

اول تو شادی بیاہ پر مسلمانوں کو بلایا ہی نہیں جاتا اگر بوقت ضرورت بلا لیے جاتے تو انہیں برتنوں میں کھانا دینے کے بجائے پتوں پر ڈال کر دور سے ان کی جھولی میں کھانا پھینک دیا جاتا- مسلمانوں کو کسی ہندو کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی- برصغیر پاک وہند میں نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ غیر مذہب ہونے کی بنا پر ایسا سلوک روا رکھا جاتا بلکہ ہندو اپنی ہی قوم کے لوگوں کے ساتھ متعصبانہ رویہ رکھتے- اونچی ذات والے برہمن اپنے سے کم تر ذاتوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے اور ان کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ رکھتے-

بانو قدسیہ نے ناول کے دوسرے حصے آبــــاد ویــــرانے میں برصغیر پاک وہند کی مشترکہ تہذیبی معاشرے میں جو سماجی برائیوں عام تھیں ان سے پردہ ہٹایا ہے- مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں مخلوط تعلیمی نظام تھا- لڑکیاں اور لڑکے سکولوں میں بھی اور گھروں میں بھی مل جل کر کھیلتے اس مخلوط تعلیمی نظام کا یہ نتیجہ نکلا کہ نوبالغ لڑکیاں لڑکے ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے- بات بات پر ایک دوسرے کو چھوتے، کبھی سر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتے، کبھی اپنا برہنہ جسم مخالف جنس کو دکھانے کی کوشش کرتے- اپنے ہاتھوں سے بالوں میں کنگھی کرتے، ایک دوسرے کو باہوں میں بھرنے کی کوشش کرتے- بچے مغربی رسائل پڑھ کر شرما شرمی بھول چکے تھے- ناول کی کہانی میں ایک بچہ خود سے جوان سال لڑکی کے پیر چومتا ہے اور اس کے عشق میں بری طرح مبتلا نظر آتا ہے-

لڑکیاں اپنی استانیوں کے عشق میں مبتلا ہیں- ان کے حسن کے قصیدے پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں- استانیوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہیں جیسے ایک جواں سال لڑکا کسی دوشیزہ کو دیکھتا ہے- نوعمر لڑکیاں اپنی جوانی اور حسن کو منوانا چاہتی تھیں- ہر وقت نک سک سے تیار رہتیں تاکہ کوئی ان کے حسن کو سراہے- بلوغت کی آگاہی انہیں بہت کچھ کرنے پر مجبور کرتی- جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی لڑکیوں کو یہ خیال آنے لگا کہ ان کا جسم بھی کچھ معنی رکھتا ہے- سارا سارا دن آئینے میں اپنا ہی حسن دیکھ کر شرماتی رہتی- نوجوان لڑکے ایسی کتابیں پڑھتے جس میں مغربی ہیرو برہنہ حالت میں ہوتے- نوجوان سگریٹ پیتے اور غیر اخلاقی حرکتوں میں ملوث دکھائی دیتے ہیں -

بانو قدسیہ نے اخلاقی اقدار کے بحران کو خونی رشتوں میں دکھایا ہے- جنسی بے راہ روی معاشرے میں اس

قدر عام ہو چکی تھی کہ خونی رشتوں کے تقدس تک کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مصنفہ نے بہن کے اپنے بہنوئی کے ساتھ ناجائز تعلقات ناول کی کہانی میں دکھائے ہیں۔بہن کا اپنے بہنوئی سے رشتہ احترام کا ہے۔اپنی ہی بہنوں کے گھر خراب کرنا اوران کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بہنوئی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرنا انتہائی شرمناک فعل ہے۔

ناول کی کہانی میں ایک بڑی عمر کی عورت جو رشتے میں نابالغ لڑکے کی خالہ تھی۔خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے اور وہ عورت اس مقدس رشتے کا بھی لحاظ نہیں کرتی اور بہانے بہانے سے لڑکے کی گردن میں باہیں ڈال دیتی اور جب کوئی نہ دیکھ رہا ہو تو اس کے گال چومتی۔سب کے سامنے اسے بچہ کہتی اور رات کے اندھیرے میں نازیبا حرکتیں کرتی۔ بیماری کا بہانہ بنا کر اپنی خدمت کروانے کے لئے ساری ساری رات اسے اپنے پاس بٹھائے رکھتی اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتی کبھی کمر میں ہاتھ ڈال دیتی۔اپنی عمر اور رشتے کے تقدس کا لحاظ کیے بغیر جنس اس شدت سے اس پر حملہ آور ہو چکی تھی کہ وہ اپنے ہی بھانجے کے ساتھ ناشائستہ حرکات کرتی نظر آتی ہے۔

ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھیں۔لڑکیاں ایک دوسرے پر اپنا حق جتاتی کوئی لڑکی اگر کسی لڑکے سے بات کرے تو بیویوں کی طرح حسد کا شکار ہوتی۔لڑکیاں ایک دوسرے میں دلچسپی لیتی ان کو خط لکھتی خطوں کا جواب نہ ملنے پر بے پروائی کا گلہ کرتی اور لڑکیوں کی خاطر روتی رہتی۔ دوسری لڑکیاں قسمیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلاتی لڑکیوں کے درمیان عہد و پیمان جاری رہتے ایک دوسرے کی منتیں کر کے جس طرح محبوب کو منایا جاتا ہے مناتی۔

نو بالغ لڑکیوں نے بچپن ہی میں اپنے لیے لڑکے پسند کر لیے تھے۔ماں باپ لڑکیوں کو تعلیم دلوانے سے ڈرتے کہ ان لڑکوں کے ساتھ مل کر کہیں ہماری عزت تار تار نہ کر دیں۔لڑکے لڑکیاں آزادانہ ملتے جلتے لڑکیاں چاہتیں کہ انہیں اپنے بازو میں کوئی بھر لے۔لڑکے اپنے چہرے کو ان کے بالوں میں ڈبو کر اپنی خواہشات کا اظہار کرتے۔ عورت سے اس قدر قربت کے بعد لڑکیوں کے جسم سے آنے والی مہک مردوں کی بہت سی خواہشات کو جگا دیتیں۔ لڑکیاں بھی بہانے بہانے سے اپنے عاشقوں سے باتوں میں لگی رہتی اندر ہی اندر ان کی بڑھتی ہوئی خواہشات انہیں مخالف جنس سے قربت پر مجبور کرتی۔مرد و زن کی اس قدر قربت رکھنے کی وجہ سے جنسی بے راہ روی معاشرے میں عام ہو چکی تھی۔

ہاسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کو ان کے عاشق ملنے آتے لڑکیاں نہ تو ان کے مذہب کی ہوتی اور نہ ہی ان میں کوئی دلچسپی رکھتیں محض اپنے حسن کے قصیدے سننے کے لیے وہ ان مردوں سے افیئر چلاتی۔لڑکے بھی لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لئے طریقے ڈھونڈتے رہتے ان کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔عاشق، رازدان، منگیتر وارڈن سے جوڑ توڑ

کر کے ہفتے میں کئی کئی بار لڑکیوں سے ملنے آتے-وارڈن بھی رشوت لے کر ان لڑکوں کو ملنے کی اجازت دے دیتی-

قیام پاکستان سے قبل ایک کثیر المذہبی معاشرے میں رہنے والے لڑکے لڑکیاں غیر مذہب کے لوگوں سے تعلقات رکھے ہوئے اور اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ غیر مذاہب کے لوگوں میں شادی ممکن نہیں پھر بھی شادی کرنا چاہتے انہیں اس بات کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں تھی کہ ان کا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا-والدین نے دوسرے مذاہب کی دیکھا دیکھی بچوں کو اس قدر آزادی دے رکھی تھی کہ وہ مذہب کا لحاظ کیے بغیر مذہبی حدود کو پار کرتے-

لڑکیاں کھلم کھلا لڑکوں کے ساتھ تعلقات رکھتی-والدین اس بات کو برا بھی نہیں سمجھتے- جب لڑکیاں خود ہی پکے ہوئے آم کی طرح مردوں کی جھولی میں آ گرتی مرد بھی ان کو نظر انداز نہیں کرتے-مرد منگیتر اور بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ان کے خیال میں اگر کوئی لڑکی ان کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا کوئی بری بات نہیں-اگر ان کی منگیتر یا بیوی ان کو نظر انداز کرے تو اس پر شک کرتے ہیں کہ وہ وہ کسی اور مرد میں دلچسپی لینے لگی ہے-

برصغیر پاک وہند کی تقسیم کے بعد تہذیب و ثقافت شکست وریخت کا نشانہ بنی-ناول کی کہانی میں قیام پاکستان کے دوران جو حالات وواقعات پیش آئے ان میں تہذیبی و ثقافتی رویوں میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی مصنفہ نے ان کو واضح طور پر دکھایا ہے-برصغیر پاک وہند ایک کثیر المذہبی معاشرہ تھا جس میں ہندو، مسلم، سکھ، بدھ مذہب کے لوگ مل جل کر رہ رہے تھے-یہ کثیر المذہبی معاشرہ تقسیم کا اعلان سنتے ہی ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا-ان تمام مذاہب کے لوگوں کا ایک دوسرے سے رویہ یکدم بدل گیا-انسانیت کو بھلا کر معصوم بچوں کا بے دریغ قتل کیا گیا عورتوں کی آبروریزی کی گئی-مصنفہ کے حساس ذہن نے ان تمام واقعات کو بڑی باریک بینی کے ساتھ اپنی تحریروں میں شامل کیا-بانو قدسیہ تقسیم کے دن کے حالات کو اپنی زبانی یوں بیان کرتی ہیں:

> دن گرم ہو گیا-رات ہونے سے پہلے بہت سے لوگ ہمارے آنگن میں جمع ہو گئے اور اس نے ریفیوجی کیمپ کی شکل اختیار کر لی-ان میں سے چند ایک کے سوا اکثر سے ہماری جان پہچان بھی نہیں تھی-چودہ اگست کو گرم آسمان ہمیں چوطرفہ گھیرے ہوئے تھا-وہی چھتی گلی جیسا راستہ' باورچی خانے میں کام کرنے والی بنگالی مریم' بھینس کا دودھ دوہنے والا نزیر' نانک چندی اینٹوں والی پچھلی گلی' پچھواڑے کھلا گراؤنڈ' سب کچھ وہی تھا.... لیکن نہ جانے کون کھڑیا مٹی سے ہماری ڈیوڑھی پر نشان بنا گیا تھا-یہ نشان ایسا تھا جس نے ہندو سکھوں کے اس محلے میں ہمارے گھر کو بالکل الگ تھلگ کر دیا تھا-اس نشان کو

خطرہ سمجھتے ہوئے ہم نے آہستہ آہستہ سامان باندھنا شروع کر دیا تھا.... [۲۴]

برصغیر کی تقسیم کے وقت جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔اس قدر مشکل گھڑی میں جب نہتے لوگوں کا قتل ہو رہا تھا۔کچھ بے ضمیر لوگ لاشوں کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔بعض سفاک لوگ مخلوق خدا کو ختم کرنے کی نیت سے کنوئیں میں زہر ڈال دیتے۔ناول میں بانو قدسیہ تقسیم کے حالات کو یوں بیان کرتی ہیں:

ڈاکٹر صیب جی جب۔۔۔۔ہم فتح پور چوڑیاں کے قریب تھے ناں تو جتھہ پڑ گیا۔۔۔بڑے بندے وڈ دیئے جی۔۔۔باقی بھاگ گئے'کچھ لک لکا گئے چری کے کھیت میں.... درختوں کے اولے۔۔۔۔پاس ایک گراں تھا جی سارے ادھر کو بھاگے۔۔۔۔

وہاں کیا کرتے تھے۔۔۔اپنے۔۔۔پیچھے۔۔۔؟

وہاں تو جی آپاں۔۔۔۔ابا مزارعہ تھا چودھری جی کا۔۔۔واڈی بیجی کرتا تھا جی... اماں کپاہ چنتی تھی۔۔۔۔میں سبزیاں توڑتا تھا ڈنگر پشو دیکھتا تھا۔۔۔۔ڈاکٹر صیب جی! جب فصل اٹھا لیتے ناں کنک کی تو فیر میں جھاڑو پھیر پھیر کر بڑی کنک جمع کر لیتا تھا۔۔۔۔

یکدم اس کی گرے آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

کیا ہوا؟.... کیا یاد آگیا؟...

وہ جی ایک باری جی۔۔۔۔ایک باری۔۔۔۔میں نے کھیتوں سے ہونجھ ہانجھ کے جی دو بوریاں کنک کٹھی کر لی تھی۔۔۔۔۔پھر منشی آگیا تھا جی'اس نے ڈاکٹر جی۔۔۔۔۔۔اس نے جی دانے بھی لے لیے اور جی مجھے مارا جی بہت مارا۔۔۔۔ترے مہینے ڈاکٹر جی میں منجے پر پڑا رہا۔۔۔۔میری ماں کرلائے۔۔۔دانے لے لیتا میرے لالو کو نہ مارتا جی۔۔ [۲۵]

درج بالا مکالمے میں کیمپ میں لٹے پٹے آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک مہاجر بچے اور ڈاکٹر کے مکالمے سے ہجرت کے حالات و واقعات کا پتا چلتا ہے کہ ہجرت کے دوران لوگ کس قدر بے دردی سے قتل کیے گئے اور قیام پاکستان سے پہلے جاگیر دار طبقہ مزارعوں کے ساتھ جو ظلم و ستم روا رکھتا تھا ان تمام حالات کو بانو قدسیہ نے ایک مزارعے کے بچے کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔

ہجرت کے وقت جس کرب سے لوگ دوچار ہوئے ساری عمر وہ نارمل زندگی کی طرف واپس نہیں آسکے۔ناول کا ایک نسوانی کردار جو ہندوستان میں ایک خوشحال گھرانے میں پلی بڑھی۔اپنی مہندی والی رات فسادات کا شکار ہو کر کسی طرح کیمپ میں پہنچا دی جاتی ہے لیکن بے ہوشی کی حالت میں اس کے ساتھ کوئی درندہ جنسی تشدد کرتا ہے۔

اسے اپنے ساتھ پیش آنے والے افسوسناک واقعے کا علم تک نہیں ہوتا- ہندوستان میں بلوائیوں کے ہاتھوں اپنے خاندان کو کٹتا دیکھنے کا منظر ساری عمر اس کے ذہن سے محو نہیں ہو پاتا-

> ایسی عورتیں جن کے گھر والے یا تو بچھڑ گیا پھر فسادیوں نے مار ڈالے..... یہ جو سبھی اپنے گھروں کی' جھونپڑوں کی رانیاں ہوں گی' اب نوکرانیاں بننے کی بھی اہل نہیں رہیں؟---ایسی عورتیں جن کے ہاتھ ہمیشہ کے لئے سوالی بن گئے تھے' یہ اس حیات کو برقرار رکھنے کا سوچ رہی تھیں جو موت سے بدتر تھی---ان کے وہ سنہری اصول کہاں تھے جو یہ پالنے سے سیکھتی آئی تھی وہ اقدار کیا ہیں جن پر ان کی زندگی کی اساس تھی---ابھی تو مہاجر عورتوں پر ہی عذاب نازل ہو رہا ہے- پھر اغواشدہ عورتیں آئیں گی---کیا وہ بھی تو ایک اغواشدہ عورت نہیں ہے---ہاں وہ بھی ایک اغواشدہ عورت تھی جسے سیاسی' معاشی' معاشرتی فیصلوں کا احساس نہ تھا--- [۲۶]

ناول کی کہانی میں اس کردار کی مسلسل داخلی خود کلامی اس کے ذہنی انتشار اور اضمحلال کا پتا دیتی ہے- ہجرت کے فسادات دار کا شکار ہونے والا یہ نسوانی کردار اپنے جیسی کئی مہاجرین عورتوں کے دکھ میں مبتلا نظر آتی ہے- ہندوستان میں اپنے پیاروں کے نہتے قتل ہو جانے کے دکھ میں مبتلا اس کردار کو جب اپنی عصمت دری کا پتہ چلتا ہے تو وہ نفسیاتی طور پر بری طرح مجروح ہوتی ہے- ہجرت کے دوران وہ لٹی پٹی بے آسرا تنہا کسی کیمپ میں بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوتی ہے ان حالات میں کوئی بے ضمیر شخص اس کے ساتھ جنسی زیادتی کرتا ہے- ہجرت کے دوران ایسے بہت سے واقعات در پیش آئے جن میں مذہبی اور سماجی اقدار کا جنازہ نکالا گیا- پہلے سے ہی مجبور بے بس لوگوں کو جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر مزید اذیت اور دکھ میں مبتلا کیا گیا- ان حالات میں جب انسانیت کی اس بری طرح تذلیل کی جا رہی تھی روایات و اقدار کی بھی ہو رہی تھی-

تقسیم کے واقعے نے اخلاقی اقدار کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا- ہندو مسلم دونوں اقوام کے لوگ اخلاقی قدروں اور انسانیت کو بھلا کر معاشرتی اقدار سے عاری ہو کر لوگوں کو نقصان پہنچانے میں مصروف تھے- تقسیم کے نتیجے میں نہ صرف سیاسی انقلاب آیا بلکہ سماجی اور اخلاقی قدروں کو بھی شدید نقصان پہنچا عورتوں کی عزتیں پامال کی گئیں، ٹرینوں کو لوٹا گیا، انسانیت کا بے دریغ قتل کیا گیا اقدار و روایات کی پامالی کی گئی- انسانی قدروں کی زوال پذیری نے لوگوں کو ذہنی اور جذباتی شکست و ریخت سے دوچار کیا- بانو قدسیہ نے اس بے حس زوال پذیر معاشرے کی تصویر کشی بڑی عمدگی سے کی ہے-

تقسیم ہند کا واقعہ ایک ایسا واقعہ نہیں تھا جو محض ملکوں کی تقسیم کا واقعہ ہو بلکہ تقسیم کے نتیجے میں ایک پوری

تہذیب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ تقسیم کے وقت ایک بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر کے پاکستان آ کر آباد ہو گئے۔ وہ خود تو پاکستان آ گئے لیکن اپنی روح برصغیر کے ان علاقوں میں چھوڑ آئے جہاں ان کی ساری زندگی گزری تھی۔ لوگوں کے اندر اپنی تہذیب کو چھوڑ دینے کا دکھ تھا۔ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر ایک بالکل نئی تہذیب میں داخلہ ایک ذہنی کرب تھا جس سے وہ لوگ دوچار ہو رہے تھے۔

ہجرت کر کے اپنی زمینوں کو خیر باد کہہ کر ایک بالکل نئی نامانوس تہذیب میں بسنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ صدیوں سے جس تہذیب میں وہ لوگ رہ رہے تھے اس میں وہ اس قدر رچ بس گئے تھے کہ اس کو چھوڑنا ان کے لیے نہایت تکلیف دہ عمل تھا۔ پاکستان کی طرف ہجرت ایک طرح کی جبری منتقلی تھی کیونکہ وہ اپنی تہذیبی اقدار کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا کلچر برصغیر میں ہی رہ گیا جس کو وہ ساری زندگی فراموش نہیں کر سکے۔

ناول کی کہانی میں ایک ایسا ہی کردار جو تقسیم ہند کے بعد نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو گیا۔ ہجرت کا کرب اسے داخلی سطح پر بری طرح متاثر کرتا ہے۔ پاکستان آ جانے کے بعد نئے ماحول میں یہ کردار ساری عمر رچ بس نہیں سکا۔ اس کردار کے ہاں برصغیر کے شاندار تہذیبی و ثقافتی ورثے سے بچھڑنے کا دکھ اور اپنے سنہرے ماضی کی یاد ملتی ہے۔ پاکستان میں آباد ہوئے اسے اڑتالیس سال کا طویل عرصہ گزر جاتا ہے۔ یہ کردار ایک نامور بزنس ٹائیکون بن جاتا ہے۔ دنیا کی ہر نعمت اس کردار کے پاس ہوتی ہے اولاد، روپیہ پیسہ کئی فیکٹریوں ملوں کا مالک ہو کر بھی اس کو کبھی قلبی سکون حاصل نہیں ہو پاتا۔ ہر وقت ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا اور اپنوں کی یاد اسے بے چین رکھتی۔

دولت کا انبار کبھی بھی اپنوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ اپنے بہن بھائیوں والدین دوستوں حتیٰ کہ جہاں اس کا بچپن گزرا اس علاقے کے بیل بوٹوں کو بھی یہ کردار یاد کر کے کڑھتا رہتا ہے۔ اپنی تہذیب سے کٹ کر نئے ماحول میں آ کر پیر نہیں جما سکا اور افسردگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تقسیم کے بعد کی جانے والی ہجرت نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی ہجرت بھی تھی۔ اپنے تہذیبی ورثے سے دوری لوگوں کے لئے ساری عمر کرب کا باعث بنی رہی۔

> شوکت مغل کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا..... جب کبھی وہ چند لمحوں کے لیے بھی تنہا بیٹھتا تو ابا جی، دادا جی، ساجدہ ماں۔۔۔۔۔ اور راحیلہ آنکھوں میں گھومنے لگتے۔۔۔۔۔ یہ چہرے اس کے اندر آندھیوں کی طرح چلتے اور وہ ریت کے ٹبے کی طرح اڑتا پھرتا.... دیر تک وہ اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھ کر پرانی سوچوں میں گم ہو جاتا۔ خیالات کا ہجوم اسے بے قرار کر دیتا اور وہ کمرے میں گھومنے لگتا.... اتنے برس گزر جانے کے باوجود نیا وطن اور بیوی کے ہوتے ہوئے بھی اوما کہیں سے نکل آتی۔۔۔۔ [۲۷]

پاکستان میں اپنی ساری عمر گزارنے کے باوجود یہ کردار اس تہذیب کو اپنا نہ سکا۔ اس کو برصغیر پاک و ہند کا وہ

سنہری دور جس میں اس کے والدین بہن اور بچپن کے دوست تھے ان کی یادیں ساری عمر تنگ کرتی رہیں۔ ہجرت کوئی ایسا انہونا واقعہ نہیں تھا جو دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ پیش آیا تھا۔ دنیا میں بہت سے لوگ نقل مکانی کرتے رہتے ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی جبلی منتقلی نے لوگوں کے حواس کو بری طرح متاثر کیا۔ وہ صرف اپنے گھروں اور زمینوں کو چھوڑ کر ہی نہیں جا رہے تھے بلکہ اپنی اقدار و روایات اور تہذیب کو بھی خیر باد کہہ رہے تھے۔ یہی احساس ناول کی کہانی میں ہجرت کرنے والوں کے ہاں نظر آتا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے آئے گے مہاجرین کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ملازمت کے لئے کہیں جاتے تو مہاجر کا لفظ سنتے ہی انہیں وہاں سے بھگا دیا جاتا۔ کہیں کسی گھر میں چوری ہوتی تو اس کا الزام مہاجرین پر لگتا۔ ہر جگہ مہاجرین کو شک و شبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا انہیں چور ڈاکو سمجھا جاتا۔ ہجرت کا کرب اپنے ملک کو چھوڑ دینے کا دکھ اور لوگوں کے اس رویے نے مہاجرین کو مزید ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔

مہاجر عورتوں کو لوٹ کا مال سمجھ کر سب ان کی عزتیں لوٹتے بے یار و مددگار دیکھ کر ہر کوئی ان کو شہوانی نظروں سے دیکھتا۔ کیمپ میں پڑی بے بس لاوارث عورتوں کو پیسے دے کر رات گزارنے کی پیشکش کی جاتی۔ کہیں اکیلی باہر نکلتیں تو مردوں کی نظریں ان کے جسموں کی پیمائش کرتیں۔ راستے سے گزرتا ہر مرد ان کو چھیڑتا، آوازیں کستا۔ ایک مہاجر لڑکی جو بازاروں میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی مرد اسے چھیڑتے تو وہ ڈر کر ایک نیک دل عورت کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ یہ نیک دل عورت اسے لوگوں کی غلیظ نظروں سے بچانے کے لیے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ لیکن اپنے شوہر کی حریصانہ نظروں سے اسے بچا نہیں پاتی۔

> ایک روز ملک صاحب مغرب کے وقت آئے تو ملکانی اور راحیلہ دونوں تخت پوش پر کھڑی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ملک دلدار کچھ فاصلے پر بیٹھ کر ان کو دیکھنے لگا۔ راحیلہ کا قد لمبا' رنگ کھلا کھلا' ناک پر بڑا سا تل اور پاؤں بڑے خوبصورت تھے۔ اس نے کانوں کی دونوں جانب دوپٹہ اڑس رکھا تھا اور اس وقت وہ ایشیائی لگنے کے بجائے کچھ یمنی' کچھ لبنانی' تھوڑی سی مراکش کی لڑکی لگتی تھی۔ جب وہ رکوع میں گئی تو نہ جانے کیوں ملک صاحب کو گندے گندے خیال آنے لگے۔ [۲۸]

اعلیٰ حسب نسب رکھنے والی آسائشات میں پلی اس مہاجر لڑکی کو ملک تنہا لاوارث اور مجبور سمجھ کر اس کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر وقت اسے سر سے پاؤں تک گھورتا اس کے جسم کا ناپ کرتا۔ سارا وقت اسے اپنی نظروں کے حصار میں رکھتا۔ اسے اکیلا پا کر اس کے ساتھ جنسی زیادتی کا ارادہ رکھتا ہے۔

مہاجرین لڑکیوں کو پاکستان کے رہائشی اپنے گھروں میں ملازمہ رکھنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ لٹی پٹی، اجڑی

ہوئی ان لڑکیوں کو مرد اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے قابل تو سمجھتے لیکن کوئی بھی ان کو گھر کی عزت بنانے پر تیار نہیں تھا۔ اس معاشرے کے لوگوں کا خیال تھا کہ مہاجرین کے اندر وفاداری نہیں پائی جاتی۔ان پر ترس کھا کر انہیں اپنے گھر میں رکھ بھی لیا جائے تو موقع پاتے ہی گھر کا ساز و سامان لے کر فرار ہو جائیں گی۔

ناول کی کہانی میں قیام پاکستان کے بعد جدید پاکستانی معاشرے میں ڈیرہ ڈالے ہوئی معاشرتی اور سماجی برائیوں کا ذکر ملتا ہے۔پاکستان کے قیام کا مقصد تو یہ تھا کہ اس ملک میں اسلام کے اصولوں کے مطابق آزادی کے ساتھ لوگ اپنی زندگی بسر کریں۔لیکن مسلمان اپنے مذہبی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول کی کہانی میں سید جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے کی وجہ سے سب سے زیادہ معتبر اور عزت والے ہیں۔ وہ اپنی اتنی اعلی ہستی سے نسبت رکھنے کے باوجود ڈاکے ڈالتے چوریاں کرتے ہیں۔سیدانیاں اسلامی لباس زیب تن کرنے کے بجائے جدید طرز کا انگریزی لباس پہنتی ہیں۔

مذہبی لوگ نماز، زکوۃ، صدقہ خیرات محض دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں۔ان کا مقصد اللہ تعالی کی رضاو خوشنودی حاصل کرنا نہیں بلکہ لوگوں سے تعریفیں بٹورنا بن چکا تھا۔قربانی جیسا عظیم مذہبی فریضہ محض نمود و نمائش کی خاطر ادا کیا جاتا۔مذہبی حضرات قربانی کے جانور خرید کر اپنے حلقہ احباب میں اس کی تشہیر کرتے۔مذہبی لوگ کثرت ازدواج کے شوقین تھے۔اپنی رنگین مزاجی کو اسلام کے احکامات سے تعبیر کرتے۔بیک وقت چار شادیاں کر رکھی تھیں۔جہاں کہیں دوسری عورت نظر آجاتی پہلی بیوی کو طلاق دے کر نئی شادی رچا لیتے۔اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ اسلام میں طلاق کے عمل کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔اپنی طبیعت کی رنگین مزاجی کو مذہب کا لبادہ اوڑھا کر کہتے کہ اسلام نے چار شادیوں کا حکم دیا ہے۔اسلام میں چار شادیاں فرض نہیں ہیں بلکہ بیوہ سے شادی یا ضرورت مند سے شادی کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔یہ لوگ اس بات کا تو خیال نہیں رکھتے کہ اسلام میں نگاہ نیچی رکھنے کا بھی حکم ہے اور تمام بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اپنی مرضی کے مطابق جہاں اپنا مفاد دیکھتے اسلام کے نام پر وہاں عمل کر گزرتے۔ایسے لوگ مذہب اسلام کے نام پر بدنما دھبا ہیں۔

> دوسروں کو بغلی گھونسہ مارنا' چغلی' غیبت' کام میں ڈنڈی مارنا' فائل چھپا کر افسر کو کھپانا' سروس رولز جتا جتا کر افسر کی روح قبض کرنا' سائلوں کی سنی ان سنی سے انہیں ملول رکھنا' ہر فائل کو دنوں' مہینوں التوا میں رکھ کر ضرورت مندوں کو پھیرے لگوانا' چھوٹے سے کام کو مہم بنانا.....ذاتی طور پر ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مولوی صاحب کی بھتیجی سے نکاح کر کے انہوں نے مولوی صاحب پر وہ بڑا احسان کیا ہے.....کان بھرنے سے بھی وہ کبھی نہ چوکتے.... [۲۹]

اس کردار کی اخلاقی کمزوریوں کی داستان بیان کر کے بانو قدسیہ نے مجموعی طور پر جدید پاکستانی معاشرے کا رویہ بیان کیا ہے۔ ہر شعبہ ہائے زندگی میں اعلیٰ افسران سے لے کر چھوٹے کلرکوں تک ہر سطح پر رشوت لی اور دی جاتی تھی۔ اس مقام پر کسی کو اسلام کی تعلیمات یاد نہیں رہتیں۔ مذہب اسلام میں رشوت لینے اور دینے والے دونوں کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ ناول کا یہ کردار بھی ایک ایسا انسان ہے جس کے اندر تمام اخلاقی کمزوریاں اور سماجی برائیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ ایک جونیئر کلرک کا کردار ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے ذریعے سے کلرکوں کی عادات و خصائل بیان کی ہیں کہ کس طرح وہ ایک چھوٹے عہدے پر ہو کر بھی بڑے بڑے گھپلے کرتے ہیں۔ غیبت کرنا اور دوسروں کے کان بھرنا ان کا وطیرہ ہے۔

جدید پاکستانی معاشرے میں مادہ پرستی عام تھی۔ حکومت نے ان لوگوں کو جو ہندوستان میں کوٹھیاں اور جائیدادیں رکھتے تھے پاکستان میں اتنی ہی زمین دینے کا اعلان کیا مقامی لوگ بھی دھوکہ دہی سے حکومت سے زمینیں بٹورنے لگے۔ ہر شخص کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی تھی۔ ڈاکے اور چوری کا مال دکان دار کھلم کھلا بیچتے اور منافع چوروں ڈاکوؤں کے ساتھ آدھا آدھا کرتے۔ ہر شخص ہی پیسے کے لالچ میں غلط کاموں میں ملوث نظر آتا ہے۔ ملکی قوانین پر کوئی بھی شخص عمل نہیں کر رہا ٹریفک کی صورتحال انتہائی دگرگوں ہیں۔ موٹر سائیکل سوار ٹریفک قوانین کو توڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ سامان سے لدھے ٹرک چھوٹی گاڑیوں کو کچل کر آگے نکل رہے ہیں۔

کسی بھی شعبے میں دیانتداری سے کام نہیں کیا جا رہا۔ ہر شخص دوسرے کو تو مورد الزام ٹھہراتا ہے لیکن اپنا فرض کوئی بھی امانت داری سے ادا نہیں کرتا۔ سڑکیں تعمیر کرنے والے امانتداری سے کوئی کام نہیں کرتے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر شعبے میں ہیرا پھیری کی جاتی ہے۔ چند پیسوں کے عوض لوگ ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ پہلے سے کمزور معیشت کو مزید نقصان پہنچایا جا رہا ہے قیمتیں بلاوجہ بڑھائی جاتی ہیں ٹیکسوں میں زیادتی سے غریب عوام بدحال ہے۔ کرپشن مہنگائی سیاستدانوں کی دھاندلی سے ملکی حالات ابتری کا شکار ہیں۔

پاکستان کو بنے طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود تعلیمی نظام کا برا حال ہے بچے زمین پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو ایمانداری کے ساتھ انجام نہیں دیتے۔ اپنے ماتحتوں پر پورے اسکول کی ذمہ داریاں ڈال کر ہیڈ ماسٹر اپنے ذاتی کاروبار میں مشغول رہتے۔ معاشرے کا ہر فرد غرض کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتا ہو ملکی مفاد سے زیادہ اپنا مفاد عزیز رکھتا۔ ملکی املاک کو نقصان پہنچاتے ہوئے ذاتی مراسم کی بنا پر اعلیٰ عہدوں پر فائز سرکاری افسران پاکستان کی زمین رشوت لے کر کسی بھی نااہل شخص کو تھما دیتے۔ پاکستانی دنیا بھر میں بے ایمان اور ہیرا پھیری کرنے والے مشہور تھے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں پاکستان کا سامان لوگ نہیں خریدتے۔ پاکستان

کا مال اگر اچھی کوالٹی کا بھی ہوتا تو بھی لوگ پاکستانیوں پر بھروسا نہیں کرتے تھے-اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی تاجر ایمان داری سے کوئی کام نہیں کرتا-

جدید پاکستانی معاشرے میں پھیلی جنسی بے راہ روی کو بانو قدسیہ نے ناول کے ایک کردار کے ذریعے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے-ناول کا یہ کردار ذہنی پراگندگی کی علامت ہے-اس کے ذہن میں ہر عورت کو دیکھ کر یہی خیال آتا کہ وہ اس کے ساتھ مار پیٹ کرنے کے بعد جنسی تشدد کرے-نفسیاتی عوارض میں مبتلا یہ کردار اپنے خونی رشتوں کے تقدس تک کا لحاظ نہیں کرتا-اپنی بھابھی پر بھی غلط نگاہ رکھتا ہے-اپنی بھابھی کا ہر وقت پیچھا کرتا، اسے کام کرتے ہوئے چھپ چھپ کر دیکھتا اور اپنے ذہن میں اس کے جسمانی اعضاء کو لا کر گندے گندے خیالات لاتا-بھابی جہاں سے گزرتی اس کے گیلے پیروں کے نشانوں کو چومتا-اپنے بھائی سے رقابت رکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے بھاوج اس کی نہیں ہو سکتی-اپنے بھائی کے قتل کے منصوبے بناتا کہ اس کے بعد ہی اس کی بھاوج اسے جسمانی سپردگی دے گی-

> میرا جی چاہتا ہے کسی دن بھابھی کو اٹھا کر لے جاؤں--- کسی پہاڑی علاقے میں--- کسی اندھیری گپھا کے اندر--- اسے کسی چٹان سے باندھ دوں اور بندھی ہوئی رسی میں پھولوں کی مالائیں پرو دوں--- وہ کہیں نہ جا سکے--- کسی اور کو دیکھ نہ سکے--- پھر اس کے پیر چوموں--- وہ دیوی میں پجاری- میں اسے جنگلی پھل کھلاؤں--- اسے گرم کرنے کے لیے الاؤ جلاؤں--- اسے خوش کرنے کے لیے بہار گاؤں--- اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے--- تو پھر میں اسے ماروں--- اتنا پیٹوں--- اتنی اذیت دوں کہ اس کا ذہن ماؤف ہو جائے-اس پر ماضی کی یادیں حرام ہو جائیں اور... صرف اس کا جسم رہ جائے... صرف جسم..... [۳۰]

اس کردار کی جنسی بے راہ روی کو بڑھاوا بھابھی کی بے تکلفی دیتی ہے-دیور اور بھابھی کا رشتہ ایک احتیاط والا رشتہ ہے- جس میں ایک دوسرے کی عزت اور فاصلہ نہ رکھا جائے تو بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں-بھابھی اس کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلفی برتتی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کبھی مار کٹائی کرتے اور کبھی گالی گلوچ دیتے-اس قدر بے تکلفی اور قربت کی وجہ سے یہ خرابیاں پیدا ہونا عام بات ہے-بات بات پر ذو معنی جملے بولے جائیں محرم نہ ہونے کے باوجود جب توجہ دی جائے ہاتھ پکڑا جائے اور جب بے تکلفی کی ساری حدیں پار کر لی جائیں تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں میں قصور صرف مرد کا نہیں ہوتا-مرد کو جب عورت کی طرف سے حوصلہ افزائی ملتی نظر آتی ہے تب ہی وہ شیر ہو جاتا ہے-

عام طور پر جنسی بے راہ روی کو مرد سے ہی جوڑا جاتا ہے-مرد بھی عورتوں پر بری نگاہ رکھتے ہیں لیکن عورتیں

اگر انہیں ان کی حد میں رکھیں ان کی غلط حرکات پر سختی سے پیش آئیں تو بہت سی برائیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ بانو قدسیہ نے ناول کی کہانی میں ایسی بہت سی عورتوں کو منظر عام پر لایا ہے جو خود مردوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں مردوں کے ساتھ بے تکلفی برتتی ہیں محلے کے مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی ان حرکات کو دیکھ کر مرد بھی ان کی خوشامد کرتے اور تعریفوں کے پل باندھتے نظر آتے ہیں۔ بعض عورتیں بڑھاپے کی عمر میں پہنچ کر بھی ان حرکات سے باز نہیں آتیں۔ اس قدر رنگین مزاج ہوتی ہیں کہ بہت سے مردوں سے بیک وقت تعلقات قائم کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ناول میں بانو قدسیہ نے بعض ایسی عورتوں کو بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو گھروں کی چھتوں پر کھڑی ہو کر اپنا دوپٹہ جسم سے ڈھلکا کر کر شکار پھانسنے کی کوششوں میں لگی ہوتیں ہیں یہ عورتیں شادی شدہ ہونے کے باوجود دوسرے مردوں کو اپنے جال میں پھنساتی نظر آتی ہیں۔

شادی شدہ عورتیں اپنے چہرے کو لیپ پوت کر رکھتیں۔ جس گھر میں قدم رکھتیں وہیں میاں بیوی کے مابین پھوٹ ڈلوا دیتی۔ اپنی اداؤں سے غیر مردوں کو جال میں پھنساتی۔ دوسری عورتوں کے خاوند پر ڈورے ڈالتیں۔ پہلے مرد کو اگر عورتوں سے تعلقات رکھنے پڑتے تو وہ بازار حسن کا رخ کرتا اب ان کے لیے بھی آسانی ہو گئی ایسی بہت سی عورتیں جو اپنے لیے ہر وقت شکار ڈھونڈتی مرد بھی انہی عورتوں کی تاک میں بیٹھے ہوتے ہیں۔

> ہولے ہولے وہ تو ہمارے گھر میں گھس آئی۔ مجید کو گود لے کر کھلانے لگی... ہر لمحے چہل بازی' ہر لمحے دل لگی۔ کچھ دن تو ہمارے میاں متوجہ نہ ہوئے۔ پھر ان کا بھی دماغ پھرنے لگا..... مجید کو گود لینے کے بہانے یہ بھی اسے جگہ بہ جگہ چھونے لگے..... ہر وقت مسکراہٹ.... میں تو دیکھتی رہ گئی.... کبھی مجید ان کی گود میں..... کبھی اس کی گود میں..... بچہ لینے پکڑنے میں وارے نیارے ہو رہے.... سارا دن گھسی رہتی... کہاں تو میں ہی میں تھی.... کہاں طعنے الہانے۔۔۔۔ [۱۳]

جنسی بے راہ روی میں معاشرے کو بگاڑنے میں صرف عورت کا کردار نہیں ہوتا بلکہ مرد بھی کئی کئی شادیاں کر رکھنے کے باوجود جہاں عورت نظر آتی اس کے ساتھ نازیبا حرکات شروع کر دیتے۔ بیوی گھر میں موجود ہے اس کے باوجود طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے۔ ہر عورت کو بکاؤ مال سمجھتے اور پیسے دے کر خریدنے کی کوشش کرتے۔ بانو قدسیہ نے زیر بحث ناول میں جدید پاکستانی معاشرے میں پھیلی جنسی بے راہ روی کو کرداروں کے ذریعے منظر عام پر لایا ہے اور اس معاملے میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔

بقول عبدالوحید:

> میرا یہ احساس ہے کہ اس وقت وہ (بانو قدسیہ) واحد خاتون ادیب ہیں جو صرف صداقت لکھنے اور کہنے

میں کسی مصلحت کو اپنے راستے کی دیوار نہیں بننے دیتیں، وہ معاشرے کی رگوں میں اترتے ہوئے زہر کو
اس طرح کھینچ کر باہر لے آتی ہیں کہ ان پر کسی ماہر اور تجربہ کار طبیب کا گمان ہوتا ہے۔ [۳۲]

بانو قدسیہ نے ناول کی کہانی میں اقدار کی شکست و ریخت کو ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے اندر بیان کیا ہے۔مصنفہ نے ایک ایسے زوال آمادہ معاشرے کا نقشہ کھینچا ہے جہاں سماجی برائیاں ڈیرہ ڈالے بیٹھی ہیں۔اس ذہنی پسماندہ معاشرے میں مادیت پرستی اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ مذہبی اقدار کو فراموش کر کے لوگ بے راہ روی کی راہ پر نکل پڑے ہیں۔یہ کہانی مادیت کے دوڑ میں بھاگتے ہوئے انسانوں کی کہانی ہے۔ طوائفوں بیوروکریٹ طبقہ جاگیردار پولیس اور معاشرے کا عام فرد بھی مادی آسائشوں کی خاطر اپنی مذہبی اور سماجی اقدار کو داؤ پر لگا چکا ہے ہوس زر کی لت میں مبتلا اس معاشرے کی سماجی و معاشرتی اقدار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں۔

مصنفہ ایک ایسے پاکستانی معاشرے کو موضوع بحث لاتی ہیں جہاں اجارہ دار طبقہ غلط کاموں میں ملوث آتا ہے اور بر سر اقتدار طبقے سے ٹکر لینے کی کسی شخص میں جرات نہیں۔اقتدار میں آکر سیاست دان عوام کے حقوق کا بری طرح استحصال کرتے ہیں انہیں محض اپنی جیبیں بھرنے کی فکر ہوتی ہے اور عوام اور ملکی نفع و نقصان سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔دولت کے عوض اپنے ضمیروں کا سودا کیے یہ لوگ چاہے کسی بھی عہدے پر فائز ہوں اپنی طاقت کا غلط استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔معاشرے کے کسی فرد کو ملکی ترقی سے کوئی غرض نہیں۔

نہ صرف طاقتور طبقہ بلکہ عام آدمی بھی مادی آسائشوں کی خاطر گناہوں میں مبتلا نظر آتا ہے۔انسانوں میں خیر و شر کی جنگ چلتی رہتی ہے جس میں بالآخر شر خیر پر غلبہ پالیتا ہے۔مصنفہ ایسے ہی کرداروں میں داخلی شکست و ریخت کو بیان کرتی ہیں جو شر میں مبتلا ہو کر جھوٹ، نوسر بازی، دھوکہ دہی، زنا اور قتل جیسے کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتے ہیں۔

ہوس زر اور زن کی چاہ نے انسان کو انسانیت کے درجے سے نیچے گرا دیا ہے۔معاشرے میں جنسی بے راہ روی عام ہے۔انسان خونی رشتوں سے بھی اپنا اعتبار کھو بیٹھا ہے۔خونی رشتوں کو بھی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اس تقدس کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے۔مذہب سے دوری کے باعث معاشرہ ذہنی پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔اپنے مذہبی اصولوں سے انحراف کر کے معاشرہ تہذیبی بحران کا شکار ہو چکا ہے۔اچھائی اور برائی کی کشمکش میں مبتلا انسان اس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ مادیت پرستی اور مذہبی اقدار میں سے کس کو اپنائیں۔بے راہ روی کی راہ پر چلتے ہوئے دولت کی حرص میں اپنی لاحاصل خواہشات کی تکمیل میں ہر گناہ کر گزرتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے ناول کی دوسری کہانی ایک مشترک ہندوستانی تہذیب کی بیان کی ہے۔جہاں ہندو اور مسلم صدیوں سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے شعوری اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی تہذیبوں کو اپنا رہے تھے۔

صدیوں سے دو مختلف تہذیبوں کے ایک ساتھ رہنے کے نتیجے میں اخذ وانجذاب ہونا ایک فطری بات ہے۔ناول کی کہانی میں بھی ہندو اور مسلم کرداروں کے ہاں اخذ وانجذاب مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔اپنی مذہبی رسومات کے بجائے دوسری تہذیب کی مذہبی رسومات ادا کر کے کے مذہبی اقدار زوال کا شکار ہوتی نظر آتی ہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں مسلمان ہندوؤں کے ساتھ خوشگوار تعلقات بنانے میں مگن اپنا تہذیبی تشخص کھو رہے ہیں۔جو قومیں اپنی تہذیب کو چھوڑ کر دوسری تہذیبوں کو اپنا لیتی ہیں ایسی اقوام تہذیبی و ثقافتی شکست وریخت سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ناول کی کہانی میں بھی بانو قدسیہ نے ایک ایسا مسلم معاشرہ دکھایا ہے جو اپنی اقدار وروایات کو کھو کر تہذیبی شکست وریخت کا شکار ہو چکا ہے۔مسلم معاشرہ نہ تو دوسری تہذیب کو مکمل طور پر اپنا پایا اور نہ ہی اپنی تہذیبی میراث کی حفاظت کر سکا۔مسلم تہذیب کے پروردہ اپنے تہذیبی ورثے اور اپنی انفرادی پہچان کو کھو چکے ہیں۔

برصغیر کی تقسیم کے وقت تہذیبی قدریں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئیں۔تقسیم کے وقت جو فسادات رونما ہوئے ان میں عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں معصوم بچوں کا قتل ہوا انسانیت کی بری طرح تذلیل کی گئی۔برصغیر کی تقسیم نے انسانوں کو داخلی طور پر بری طرح شکستِ وریخت سے دوچار کیا۔ہجرت کر کے لٹے پٹے پاکستان آئے لوگوں میں اپنی تہذیب کو چھوڑ دینے کا دکھ ساری عمر پاکستان میں گزارنے کے بعد بھی برصغیر پاک وہند کے سنہری ماضی کی یادیں ان کے ذہن سے محو نہ ہو سکیں۔ساری عمر وہ اپنے تہذیبی ورثے کو چھوڑ کر ایک نئی تہذیب میں داخل ہونے کے کرب سے بے چین رہے۔ایک طرف اپنوں کو کھونے کا دکھ دوسری طرف پاکستان میں مہاجرین کے ساتھ جو برا سلوک روا رکھا گیا ان کو ہر جگہ شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔مہاجرین لڑکیوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا۔ان تمام حالات واقعات نے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگوں کو داخلی طور پر انتشار کا شکار کیا۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال، آباد ویرانے (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص۱۶۔

۲۔ ایضاً،ص۲۹۔

۳۔ ایضاً،ص۱۲۔

۴۔ ایضاً،ص۱۸۔

۵۔ ایضاً،ص۲۴۔

۶۔ فرزانہ سید،نقوش ادب (لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶ء)،ص۱-۴۔

۷۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۵۷۔

۸۔ ایضاً،ص۵۱۔

۹۔ عفت افضل،بانو قدسیہ: شخصیت اور فن (حیدرآباد:ادارہ انشا،۲۰۰۳ء)،ص۵۲۔

۱۰۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۲۶۳۔

۱۱۔ ایضاً،ص۵۲۔۵۳۔

۱۲۔ صفیہ عباد،رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ (اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۷ء)، ص۱۲۶۔

۱۳۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے ،ص۲۷۶۔

۱۴۔ ایضاً،ص۱۱۶۔

۱۵۔ ایضاً،ص۱۶۷۔

۱۶۔ ایضاً،ص۱۹۰۔

۱۷۔ ایضاً،ص۱۶۳۔

۱۸۔ ایضاً،ص۱۴۳۔

۱۹۔ ایضاً،ص۲۹۷-۲۹۸۔

۲۰۔ ایضاً،ص۸۹۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۰۹۔

۲۴۔ انور سدید، بانو قدسیہ: شخصیت اور فن، ص ۱۶۔

۲۵۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص، ۴۹۴۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۱۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۷۰۔۳۷۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۰۲۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۹۴۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۳۲۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۳۴۔

۳۲۔ عزیزہ سعید، حاصل گھاٹ اور کھیل تماشا کا جائزہ (لاہور: جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۰۷۔

باب چہارم:

ناول کی زبان کے اظہار میں
تہذیبی و ثقافتی رویوں کے
مباحث اور تجزیہ

باب چہارم:

ناول کی زبان کے اظہار میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کے مباحث اور تجزیہ

ناول مختلف عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے ناول کے اجزائے ترکیبی میں ہر عنصر کی جداگانہ اہمیت ہوتی ہے. کہانی، پلاٹ، کردار، منظر نگاری سب اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ناول کی کامیابی میں ناول کی زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ قاری کی دلچسپی ناول میں برقرار رہے اور قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو. ہر مصنف ناول کی زبان کو منفرد بنانے کے لیے ایک مخصوص اور جداگانہ انداز اپناتا ہے۔ یہ انفرادی طرز نگارش ہی اس مصنف کو باقی مصنفین سے منفرد بناتا ہے۔ اسلوب میں مصنف کی شخصیت کا عکس صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں سید عابد علی عابد کا کہنا ہے:

> اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔ اس انفرادیت میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔[1]

مصنف کو انفرادیت بخشنے میں تہذیبی و معاشرتی اثرات، ماحول، ذہنی رجحانات، زندگی کے بارے میں نظریات، مشاہدہ، مطالعہ، علم، مصنف جن شخصیات سے متاثر ہوتا ہے، مصنف کی تحریر کا انفرادی پن ان تمام عوامل سے مل کر بنتا ہے ایسے تمام عوامل جو مصنف کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں مصنف کے اسلوب میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے کسی بھی تحریر کو مصنف کی شخصیت کا عکس کہا جاتا ہے۔ اسلوب میں مصنف کی شخصیت کا پرتو دیکھا ہی جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ مصنف اپنے اسلوب میں خاص قسم کے الفاظ و تراکیب ور بعض ایسی چیزوں کو اپنی تحریر کا حصہ بنانا اپنا شعار بنالیتا ہے جو اس کی شخصی شناخت بن جاتی ہے۔ ن۔م۔ راشد کی اس بارے میں رائے ہے:

> یہ ہر اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے سے ایک ادیب دوسرے ادیب سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خاص طرز کے فقرے، خاص محاورات، سانچے میں ڈھلی ہوئی تراکیب جن کو وہ بار بار استعمال کرنے کا عادی ہو، اور جن کی مدد سے اگر ہم چاہیں تو ادیبوں کے ہجوم میں بھی اسے نمایاں کر سکتے ہیں۔[2]

اردو ادب میں بانو قدسیہ کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جو ان کی تحریروں کو دوسرے مصنفین سے ممتاز بناتا ہے۔ ان کے مخصوص روحانی لب و لہجے اور فلسفیانہ انداز سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بانو قدسیہ کی تحریر ہے۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش کا اس بارے میں کہنا ہے کہ نثر نگاری میں بانو قدسیہ کا اپنا انداز اور اپنا اسلوب بیان ہے۔[3] مصنفہ کی

تحریروں میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات، ان کی معاشرتی زندگی، ان کی زندگی میں رونما ہونے والے اہم واقعات غرض زندگی کے تمام پہلوؤں کی تصویر ان کی تحریروں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔

زبان کی مدد سے تہذیب و ثقافت کی بازیافت ممکن ہے۔ کسی بھی فن پارے کی زبان سے اس دور کی تہذیب و ثقافت، تاریخ، اس دور کی سیاسی اور معاشرتی صورتحال کیسی تھی اور اس دور کی زبان کے الفاظ بھی ہم تک پہنچتے ہیں۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی اس بارے میں رائے ہے:

> اسلوب تخلیقی شخصیت اور اجتماعی شخصیت (جس میں معاشرتی اقدار، روایات، رسوم و رواج، تہذیب، رہن سہن آداب و اخلاق، عقائد، تصورات، سیاسی و معاشرتی حالات، تاریخ، نسلی اور جغرافیائی خصوصیات اور زبان کے معیار اور پیمانے شامل ہوتے ہیں) کے ملاپ سے اپنی علیحدہ شناخت بناتا ہے۔[۴]

ناول کی زبان کا مطالعہ محض اس کے ظاہری معنی کو دیکھنا نہیں ہے بلکہ مصنف کے خیالات، ناول کا مواد اور وہ تمام عناصر جن سے مل کر ناول تشکیل پاتا ہے اس میں شامل ہیں۔ ناول کی زبان کا جائزہ لیتے ہوئے ان تمام عناصر کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔ بانو قدسیہ کی زبان پر مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں رہنے کی وجہ سے ہندی زبان کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی جیسی ادبی شخصیات کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان کا لب و لہجہ فلسفیانہ اور روحانی ہو گیا تھا۔ جن شخصیات نے بانو قدسیہ کو متاثر کیا ان کی وجہ سے مصنفہ کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کے اثرات بھی ان کی زبان میں صاف دکھائی دیتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے اپنی زبان کی وجہ سے اردو ادب میں اپنا ایک انفرادی مقام بنایا ہے مصنفہ کی خصوصیت خاصہ ہے کہ وہ زبان کو منفرد بنانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اس کوشش میں بھی زبان حقیقت سے قریب تر رہتی ہے۔

زیر نظر ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کی زبان کے مطالعے کی روشنی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کو جانچا جائے گا۔ بانو قدسیہ نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں پرورش پائی لہٰذا ان کی زبان پر اس تہذیب کی گہری چھاپ موجود ہے۔ ناول کو پڑھتے ہوئے اُس عہد کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اس عہد کے سیاسی، سماجی و معاشرتی مسائل کون سے تھے؟ اس عہد میں کون سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے؟ تہذیب و معاشرت کیسی تھی۔ لوگوں کا رہن سہن، رسم و رواج، روایات کا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔

مصنفہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور مشاہدہ بہت باریک بین تھا۔ وہ اپنی افتاد طبع کی بدولت زبان میں نئی نئی تراکیب وضع کراتی رہتی تھیں۔ ناول میں ہندی جملوں کی بہتات ہے ہندی دیومالائی عناصر اور قصے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں۔ ہندو مسلم جب اکٹھے رہ رہے تھے وہ دور اور تہذیب کیسی تھی اس کا اظہار بھی مصنفہ کے ہاں

واضح نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ کا بچپن جن شہروں میں گزرا ان کی تاریخ، تہذیب، روایات، ماحول، موسم سب کا ذکر اس ناول میں ملتا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں تخیل سے زیادہ حقائق کی تصویر کشی کی ہے۔

بانو قدسیہ اپنے انفرادی طرز بیان کی وجہ سے اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں ان کا طرز نگارش باقی مصنفین سے منفرد ہے ان کے ہاں جدت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی زبان میں جدت پیدا کرنے کے لئے اس میں نئے نئے مختلف تجربات کرتی رہتی تھیں۔ اردو کے نامی گرامی ادیب اور بانو قدسیہ کے شوہر اشفاق احمد ان کے منفرد انداز بیان کے بارے میں کہتے ہیں۔

> جہاں تک تھاٹ (Thought) کا معاملہ ہے وہاں تو میں ان (بانو قدسیہ) سے متاثر ہوں۔ کیوں کہ ان کی سوچ بڑی فریش (Fresh) ہے اور اس کا انداز بہت منفرد ہے۔[5]

ناول میں جہاں کہیں کسی بات کو وضاحت سے بیان کرنا مقصود ہوتا وہاں بانو قدسیہ تلمیحات کا سہارا لیتی ہیں۔ تلمیحات کا استعمال جہاں کسی بات کو اچھے طریقے سے واضح کرتا ہے وہیں یہ ناول کی زبان کو انفرادیت بھی بخشتا ہے۔ ناول میں جابجا ہمیں تلمیحات کا استعمال نظر آتا ہے۔ قوم ہود، قوم ثمود، حضرت لوط کے گم گردہ، بنی اسرائیل، اہرام مصر اور بائبل قابیل کے قدیم تاریخی واقعات کو بانو قدسیہ ناول کے کرداروں کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتی ہیں۔ ناول میں سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> رزاق اتنے سال کیوں اتنی شان و شوکت سے زندہ رہا اور اتنی شان سے کیوں مر گیا؟ رزاق پر اس کا رب اتنا مہربان کیوں تھا کہ اس کی ساری زندگی حتٰی کہ اس کی موت بھی اس نے کوہ طور جیسی بنادی تھی۔[6]

بانو قدسیہ پاکستان بننے سے پہلے بھارت میں رہتی تھیں ان کے اس ناول میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے وہ ہندی زبان و اصطلاحات سے بھرپور واقفیت رکھتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان مصنفہ کی تحریروں کا حصہ بن گئی۔ شہر لازوال، آباد ویرانے میں بھی ہندی الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کی بھرمار ہے۔ ناول میں سے بعض ہندی الفاظ درج ذیل ہیں۔

شراپ، بھرشٹ، آگیا، وشواس، پریوار، کشٹ، ارپن، الہانا، پرگٹ، سوگند، سندھیا، دوش، پوترتا، سپتری، ارتھی، آرتی، نکرمی، مہاپاپ، پتنی، تپسوی، دوش، مورکھ۔

شہر لازوال آباد ویرانے میں بانو قدسیہ نے ہندی زبان کے الفاظ و تراکیب دیومالائی عناصر اور اصطلاحات کو نہایت خوبصورتی سے ناول کی زبان میں برتا ہے۔ یہ تمام عناصر ناول کی زبان میں ایک اچھوتا پن پیدا کر رہے ہیں۔ ان

سے ناول کا تسلسل بھی برقرار رہتا ہے اور اسلوب میں جدت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اپنے مقالے اردو ناول کے اسالیب میں بانو قدسیہ کے اسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں۔ بانو قدسیہ اپنی تحریروں میں اس قدر روانی اور اعتماد کے ساتھ ہندی دیومالائی عناصر، ہندی الفاظ، محاورے اور اصطلاحات کو شامل کرتی ہیں کہ ہندی الفاظ اور محاورے عبارت میں رکاوٹ بننے کے بجائے روانی، تسلسل اور حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ ۷ ناول میں ہندوؤں کے مذہبی دیوتاؤں کے قصے بیان ہوئے ہیں ان میں سے مہارانی سیتا کا قصہ ملاحظہ ہو۔

> جب وہ راون دیس سے آئی تو مہاراج رام نے اس کی نیک نیتی پر شبہ کیا راجہ رام کو شبہ تھا کہ رانی اتنی دیر لنکا میں رہ کر کیا اپنی نیت صاف رکھ سکتی ہے۔ پھر ایک چتا جلائی گئی اور رانی سیتا اپنی پاکبازی اور نیک نیتی کو ظاہر کرنے کے لئے آگ پر کود گئی اور آگ نے اسے کچھ نہ کیا۔[۸]

ناول میں ان قصوں کی بہتات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ پر ہندوستانی تہذیب کا بڑا گہرا اثر تھا۔ یہ قصے قدیم ہندوستانی تہذیب کے عکاس ہیں۔ بانو قدسیہ ناول میں جابجا ہندی دیومالائی قصوں کا ذکر کرتی ہیں ناول میں مصنفہ کا ہندی دیومالائی قصوں کا بکثرت استعمال ان کی ہندوستانی تہذیب سے محبت اور ماحول سے اپنائیت پر دال ہے۔ چونکہ مصنفہ ہندوستانی تہذیب کی پیداوار تھیں اس لئے شہر لازوال، آباد ویرانے میں ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں ہمیں بارہا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہندی معاشرے میں طویل عرصہ گزارنے کی وجہ سے وہ بڑی روانی اور اعتماد کے ساتھ ہندی زبان کو اپنی تحریروں میں استعمال کرتی تھیں۔ ناول میں سے ہندی جملہ ہے "جیو ہتیا پاپ ہے۔۔۔ سوریہ است ہو رہا ہے۔ سارے جانور سندھیا کے لئے جا رہے ہیں۔[۹] درج بالا ہندی زبان میں تحریر کیا گیا جملہ جس روانی اور اعتماد کے ساتھ تحریر کیا گیا بانو قدسیہ کی ہندی زبان سے گہری واقفیت کی دلیل ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں غم، خوشی داخلی کرب غرض ہر قسم کے جذبات کا اظہار گیتوں کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ گیت ہندوستانی تہذیب کی معنویت کا کھل کر اظہار کرتے ہیں۔ زیر نظر ناول میں بانو قدسیہ کرداروں کے قلبی جذبات کی عکاسی گیتوں کے ذریعے سے کرتی ہیں۔ ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کا آغاز بھی ایک پنجابی گیت سے ہوتا ہے ناول کی زبان میں گیتوں کی بہتات جہاں ہندوستانی تہذیب کی عکاس ہے وہیں بانو قدسیہ کی پنجابی زبان سے انسیت کا اظہار بھی ہے۔ مصنفہ گیتوں کے ذریعے سے کرداروں کے قلبی جذبات کی عکاسی بڑی عمدگی سے کرتی ہیں۔ ناول کے کردار کے دلی جذبات کا ترجمان ایک پنجابی گیت ملاحظہ ہو۔۔

چن کتھاں گزاری آرات وے
میری جی دلیلاں دے وات وے

میں پانی دی مچھلی.....تو بگلا بن کے آ ذرا [10]

درج بالا گیت ناول کے نسوانی کردار کے قلبی کیفیات کا ترجمان ہے وہ اپنے محبوب سے اپنی محبت کا اظہار سر عام نہیں کر پا رہی۔ اس کا سابقہ شوہر اور محبوب اس کی آنکھوں کے سامنے براجمان ہے اس کی بیوی اور باقی لوگوں کی موجودگی میں وہ اپنے محبوب سے محبت کا اظہار نہیں کر سکتی اس کے تمام شکوے شکائتیں اس گیت میں سمٹ آئے ہیں۔ اسی طرح ناول کے ایک نسوانی کردار راحیلہ کا منگیتر اپنی بہن کی سہیلی عابدہ کے ساتھ بے تکلفی برتتا ہے۔ عابدہ سے حسد اور رقابت کے جذبات رکھتے ہوئے راحیلہ کے ذہن میں ان دونوں کے بارے میں برے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے راحیلہ کے ان خیالات کو اس پنجابی گیت میں پرو دیا ہے۔ ''ساہنوں نت دے خیال برے۔۔۔ وے ماہی گھر آجاوے۔'' [11]

موسیقی ہندی کلچر کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہندو مذہب میں اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے باقاعدہ گیت گانا سیکھا جاتا ہے۔ '' شگن بن گگن پون چلت پروائی۔ [12] ایک ایسا ہی ہندی گیت ہے جو بھگوانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر ان کے دیوتا ان سے خوش نہیں ہوں گے تو ان کی آرزوئیں بھی پوری نہیں کریں گے۔ مندرجہ بالا گیت ناول کے ہندو کردار کا ہے۔ یہ گیت وہ اپنے بھگوان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے گاتی ہے۔ گیت ہندوستانی تہذیب کو اجاگر کر رہا ہے۔ ناول کا ہندو کردار اوما اپنا ہندوستانی نغمہ گاتی ہے وہ اپنی تہذیب اپنے مذہب کی نمائندگی اس گیت کے ذریعے کرتی ہے۔ ''بندے ماترم۔ بندے ماترم۔ سج رام سکھ رام۔ [13]

قیام پاکستان کے وقت راحیلہ اپنے منگیتر سے بچھڑ جاتی ہے۔ بانو قدسیہ راحیلہ کے قلبی جذبات کو گیتوں کے ذریعے بڑے موزوں انداز میں بیان کرتی ہیں۔ راحیلہ کے داخلی کرب کے اظہار کے لئے بانو قدسیہ نے پنجابی گیت کا سہارا لیا ہے۔ ناول میں جہاں کردار اپنی زبان سے اپنے جذبات و احساسات کا برملا اظہار نہیں کر پاتا۔ مصنفہ گیتوں کے امتزاج سے اس کے دلی احساسات کو بیان کرتی ہیں گیتوں کے برمحل اور موزوں انتخاب سے ناول کی زبان بھی دلکش ہو جاتی ہے اور کرداروں کی ہر طرح کی ذہنی و جذباتی کیفیات کی بھی عکاسی ہو جاتی ہے اور یہ گیت مشرقی تہذیب و ثقافت کی عمدہ ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

شہر لازوال ، آباد ویرانے کی نثر ایک سادہ نثر نہیں بلکہ اس میں شعری التزام پایا جاتا ہے۔ شعری التزام نے اس نثر کو مزید پر کشش بنا دیا ہے مصنفہ نسوانی کردار کی خوبصورتی کو بیان کرنے کے لئے وارث شاہ کا کلام

ناول میں پیش کرتی ہیں۔ بقول وارث شاہ:

ہونٹھ سرخ یاقوت جیویں لعل اندر چمکن، تھوڑی ولائتی سار وچوں
وچوں نک الف چینی دا پیلا سی زلف ناگ خزانے دی بار وچوں
دند چنبے دی لڑی کہ ہنس موتی دانیں نکلے حسن بازار وچوں
سکھی چین کشمیر جٹی قد سرو بہشت گلزار وچوں
گردن کونج دی انگلیاں روانیہ پھلیاں ہتھ کولڑے برگ چنار وچوں
باہاں ویلنیں ویلیاں گھنہ مکھن دیں چھاتی سنگ مرمر گنگ دھار وچوں [14]

یہاں بانو قدسیہ ناول کے ایک نسوانی کردار کو وارث شاہ کی شاعری کے ذریعے جزئیات کے ساتھ بیان کر رہی ہیں۔ مصنفہ نے اردو، فارسی شاعری سے اس نثر کو اور بھی خوبصورت اور دلکش بنادیا ہے۔ ناول میں مصنفہ نے جا بجا فارسی جملوں اور اشعار سے ناول کی زبان کو ایک منفرد انداز بخشا ہے۔ مصنفہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے وہ فارسی جملوں کو بڑی روانی سے برتتی ہیں کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ وہ نثر کو خوبصورت اور عالمانہ بنانے کے لئے فارسی محاورات کو زبردستی شامل کر رہی ہیں۔ ناول کے کردار بڑی روانی کے ساتھ فارسی محاورات کا موقع محل کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ مصنفہ ناول کے کرداروں کے منہ سے فارسی محاورات کو بڑے موزوں طریقے سے ادا کرواتی ہیں۔

گلیشیر میں اور کہاں؟ دنیائے خدا تنگ نیست۔ [15]

پھوپھا جی۔۔۔۔ میں خدا قسم بالکل معذور ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ [16]

ناول میں جو عہد دکھایا گیا ہے یہ وہ دور تھا جب محبت کا کھلم کھلا اظہار نہیں کیا جاتا تھا۔ ناول کا ایک کردار شاہد اپنی منگیتر سے اپنے دلی جذبات کو بیان کرنے کے لیے دیوان غالب میں سے وہ شعر دکھاتا ہے جس میں اس کے قلبی جذبات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔ ناول کا مرکزی کردار راحیلہ مشرقی تہذیب کا پروردہ کردار ہے وہ اپنے منگیتر سے اپنی محبت کا اظہار کھلے انداز میں کرنے کے بجائے ڈھکے چھپے انداز میں ایک شعر کے ذریعے کرتی ہے۔ مصنفہ نے اس کردار کے محبت کے اظہار کو فارسی شاعری کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ''پرستش ہے اور پالے، سخن درمیان نہی۔'' [17] شعر کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد راحیلہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا تھا۔ شرم و حیا مشرقی کلچر کی اقدار کا حصہ ہیں۔ اسی طرح جب راحیلہ کا منگیتر اپنی بہن کی دوست کے ساتھ بے تکلفی برتتا ہے تو راحیلہ کے جذبات کی عکاسی بانو قدسیہ غالب کے اس شعر کے ذریعے کرتی ہیں۔

رات کے وقت مئے پیے ساتھ رقیب کو لئے

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں [18]

ناول کی زبان میں فارسی اور اردو شاعری کا برملا استعمال مصنفہ کے کثرت مطالعہ کا ثبوت ہے۔ وہ ان زبانوں پر دسترس رکھنے کی بناپر جہاں چاہتی ہیں ان کو استعمال میں لے آتی ہیں۔ ان کی تحریر پڑھنے والے کو اردو اور فارسی زبان کا ادراک لازمی ہونا چاہیے تاکہ قاری اس تحریر سے لطف اندوز ہو سکے۔ ناول کا ایک کردار رخشندہ جس کی ساری زندگی امیر طبقے کی آسائش کے لئے سامان مہیا کرنے کے لئے گزرتی ہے۔ اپنی خوبصورتی کے تبصرے الاپنے والوں سے خراج تحسین وصول کرتی وہ اپنی زندگی بغیر مذہب اور معاشرے کی پابندی کے گزار دیتی ہے۔ بانو قدسیہ رخشندہ کی زندگی کو نویں صدی کے ایک شاعر راج شیکھر کی شاعری کے ذریعے بیان کرتی ہیں۔

ہم منتر تنتر کچھ نہیں جانتے
نہ گرو کرپا سے ہمیں کوئی گیان حاصل ہے
ہم لوگ شراب خوری اور زنا کرتے ہیں
اور ایسی پرستش کے وسیلے سے نجات حاصل کرتے ہیں۔۔۔
ہم لوگ شراب پیتے اور گوشت کھاتے ہیں
بھکشا سے ملا ہوا اناج ہی ہماری معاش ہے
اور مرگ چھالا ہی ہمارا پلنگ ہے
ایسا کول دھرم کیسے پسند نہ آئے [19]

یہاں مصنفہ رخشندہ کو کول دھرم کی پالن کرنے والی کہتی ہیں۔ شہر لازوال ، آباد ویرانے کی زبان میں لوک داستانوں، لوک گیتوں، تمثیلی قصوں اور قدیم زمانے کے واقعات کی بہتات ہے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو مصنفہ ان لوک داستانوں کے ذریعے بیان کرتی ہیں۔ مشہور لوک داستانوں کے کردار لیلی، سسی پنوں، رانجھا اور فرہاد کو مصنفہ ناول کے کرداروں سے جوڑ کر پیش کرتی ہیں۔

فرہاد تو جنم جنم سے ہیں لیکن فرصت کے اوقات میں۔۔۔۔ لیلیٰ لیلیٰ پکارنے سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں
بشرطیکہ کوئی بہتر کام نہ ہو۔ رانجھا بننے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن صرف پارٹ ٹائم۔ [20]

بانو قدسیہ کی اس خصوصیت خاصہ کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں مصنفہ ناول کے زمانہ حال کو پرانی لوک داستانوں زبان زد عام قصوں، تمثیلی واقعات اور قدیم صحیفوں سے مختلف اقتباسات کو اس طرح فنی طور پر

منسلک کرتی ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج کے واقعات قدیم زمانے کے واقعات ہی کی تکرار ہیں۔[۲۱] ناول میں مصنفہ نے افسانوی قصے بیان کئے ہیں۔ جو زبان زد عام ہیں لیکن حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہندوستانی تہذیب کے پروردہ ان قصوں پر بغیر تصدیق کئے ایمان لاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک افسانوی قصہ کانگڑہ ویلی میں رہنے والے لوگوں کا ہے۔

> کرلی کا جسم اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ مسلسل پندرہ دن بارش میں بھیگ کر نارمل ہوتا ہے۔ یہ پہلے پندرہ دن کرلی انڈے سیتی اور گھونسلے میں بیٹھی رہتی۔ حضرت کرلا اپنے دوستوں کے ساتھ بارش میں بھیگتے اڑتے دانہ دنکا تلاش کرتے ۔۔۔۔ پھر جھڑی ٹوٹ جاتی اور کرلی انگڑائی لے کر گھونسلے سے اٹھتی اور کرلا صاحب انڈے سینے بیٹھ جاتے۔ اب ان کے جسم میں ایسی تپش سماتی کہ پورے پندرہ دن کی مسلسل بارش پھر ہونے لگتی۔ کرلا کرلی کے انڈے سینے کے درمیان کبھی کبھی تین مہینے گزر جاتے اور دھوپ برائے نام نکلتی۔[۲۲]

بانو قدسیہ کا بچپن کانگڑہ ویلی میں گزرا۔ دھرمسالہ میں جب بہت زیادہ بارشیں ہوتیں تو اسی وادی میں پہاڑ پر رہنے والے لوگوں نے افسانوی قصے بنا رکھے تھے کہ کرلا کرلی پرندہ تھا جسے آج تک کسی نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کے متعلق کہانیاں مشہور تھیں کہ ان درختوں پر انہوں نے انڈے دیے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ پرندہ سفید چونچ اور سرخ پر رکھتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ چونچ سرخ اور باقی پرندہ سفید رنگ کا ہے۔[۲۳] لیکن یہ پرندہ ایک افسانوی پرندہ ہی تھا۔

بانو قدسیہ ناول میں کسی کردار کو زیادہ معنویت سے بیان کرنے کی غرض سے اس کردار کے حالات کو کسی قصے سے پیوست کر دیتی ہیں۔ اسی طرح کہانی کے واقعات کو بیان کرتے کرتے قاری کو تمثیلی قصوں سے بھی واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک قصہ جھیل سیف الملوک اور شہزادہ گلفام کا ہے جسے بانو قدسیہ ناول کے کردار سے جوڑ کر بیان کرتی ہیں۔

> نجم نے کلبلاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''بس میرا جی چاہتا ہے کسی دن بھابھی کو اٹھا کر لے جاؤں۔۔۔ کسی پہاڑی علاقے میں ۔۔۔ بہترین جگہ سیف الملوک ہو گی وہاں پہلے بھی ایسا تجربہ ہو چکا ہے ۔۔۔۔ شہزادہ گلفام کو پری اٹھا کر وہیں لے گئی تھی۔۔[۲۴]

زیر نظر ناول میں جگہ جگہ مصنفہ نے ضرب الامثال کا بڑی دلفریبی اور ماہرانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ ضرب الامثال کا استعمال نہ صرف تحریر کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس سے ہماری قدیم روایات، معاشرتی

اقدار اور تہذیبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ضرب الامثال کسی بھی قوم کی تہذیب و ثقافت، معاشرت، رہن سہن، روایات و اقدار غرض اس معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہیں۔ ہمارا تہذیبی و سماجی سرمایہ ضرب الامثال کے توسط سے ہم تک پہنچتا ہے۔ بانو قدسیہ نے بھی اس ناول میں اپنی تہذیب کو اجاگر کرنے کے لئے ضرب الامثال کا استعمال کیا ہے۔ یہ ناول کی زبان کو مزید دلکش بنادیتی ہیں۔ ناول میں سے ایک ضرب الامثال ہے "اکیلا چنا کیا جھاڑ جھونکے گا ڈاکٹر قیصر"۔[۲۵]

اکیلا چنا کیا جھاڑ جھونکے گا سے مراد یہ ہے کہ تنہا آدمی وہ کام سرانجام نہیں دے سکتا جو بہت سے آدمی مل جل کر سکتے ہیں۔ ناول کے کردار کو بھی یہی بات کہی جارہی ہے کہ تم اکیلے کیا کر سکتے ہو جب تک تمہارے ساتھ باقی لوگ بھی شامل نہ ہو جائیں۔

.اسی طرح ناول میں ایک ضرب الامثال کا استعمال ہوا ہے "راحیلہ کی شکل و صورت میں کچھ ایسی نمکینی اور ملامت تھی کہ یہ دیکھنا ہی آبیل مجھے مار کے مصداق ہو گیا"۔[۲۶] آبیل مجھے مار کا مطلب تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں مصیبت کو دعوت دینا، یا خود کسی مصیبت میں پڑ جانا۔ لیکن ناول میں مصنفہ ایک کردار کی خوب صورت شکل و صورت کی وضاحت کے لئے یہ ضرب الامثال استعمال کرتی ہیں کہ یہ حسین و جمیل کردار اگر کسی کی طرف دیکھ بھی لے تو صرف اس کی ایک نظر دیکھنے سے ہی اگلا شخص اس کی طرف اپنی نیت خراب کر لیتا ہے۔ جو اس نسوانی کردار کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

ناول میں سے ایک اور ضرب الامثال ہے "ماسی کرشنا کی کوکھ سے پیدا نہ ہوا تھا لیکن جب سے بہو کے جانے کی خبر پھیلی تھی۔ ماسی کرشنا نے اٹوانٹی کھٹوانٹی لے رکھی"۔[۲۷] اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ جانا یہ ایک نسوانی اور قدیم کہاوت ہے۔ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو وہ منہ سر لپیٹ کر چارپائی پر پڑی اس وقت تک ہڑتال کرتی رہتی ہیں جب تک ان کی بات مان نہ لی جائے۔ اس کا ایک مطلب ذرا ذرا سی بات پر چارپائی پکڑ کر لیٹ جانا اور روٹھ جانا ہے۔ ناول میں بھی بو نامی کردار کو جب ائیر فورس میں جانے سے اس کی ماسی روک نہیں پاتی تو منہ سر لپیٹ کر اپنے خفگی کے اظہار کے لئے چارپائی پکڑ کر لیٹ جاتی ہے۔ ناول میں سے ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

> آپ مغل لوگ بھی پورے پورے سکھ ہیں۔ اتنے برسوں یہاں حکومت کی اور کچھ نہ جانا کہ یہاں کی اکثریت کیسی ہے۔ منہ میں رام رام کو تو خوب جانا پر بغل کی چھری نہ دیکھی۔[۲۸]

"منہ میں رام رام، بغل میں چھری" یہ کہاوت ایسے منافق شخص کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو سامنے تو

بڑی چکنی چپڑی باتیں کرے، لیکن دل میں بغض رکھتا ہو اور نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے خالی نہ جانے دے۔ اس کے منہ سے رام رام تو سب سنتے ہیں لیکن اس کی بغل میں چھپی ہوئی چھری پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔

ناول میں یہ کہاوت ایک سکھ لڑکی مسلم لڑکی کو سمجھاتے ہوئے استعمال کرتی ہے کہ ہندو قوم ایک عیار قوم ہے۔ وہ بظاہر مسلمانوں سے دوستی رکھے ہوئے ہے لیکن یہ سب ان کی چکنی چپڑی باتیں ہیں ہندو کبھی بھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے وہ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ موقع ملے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ مسلمان ان کے ظاہری حسن سلوک سے متاثر ہیں ان کے دل کے کھوٹ سے واقف نہیں ہیں۔

بانو قدسیہ ناول میں کہیں بھی یہ کوشش کرتی دکھائی نہیں دیتی کہ صرف اردو کے مروج محاورے ہی استعمال کریں۔ وہ خود سے وضع کردہ محاوروں کو بھی جہاں بہتر سمجھتی ہیں بڑی روانی اور سلیقے کے ساتھ برتتی دکھائی دیتی ہیں۔ محاورات میں کسی بھی دور کی معاشرت، تہذیب اور اس پرانے دور کی پرچھائی دیکھی جاسکتی ہے محاورے اس زمانے کے الفاظ کو بھی محفوظ کر لیتے ہیں اور ان کے ذریعے اس سماج کا ذہنی رویہ بھی منظر عام پر آجاتا ہے۔

ہر دور کا اپنا تہذیبی رویہ ذاتی و معاشرتی زندگی ہوتی ہے محاورے اس تہذیب و سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور محاورات کے لفظ و معنی میں تہذیبی و ثقافتی تصورات کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ ناول میں محاروں کی بہتات ہے ہم ان محاوروں کے ذریعے اس تہذیب سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری تہذیبی تاریخ جن مراحل سے گزری، جن معاشرتی آداب رسوم و رواج نے اسے متاثر کیا وہ بھی ان محاورات کے ذریعے ہمیں پتا چلتی ہے۔

جب گائے ایک کھونٹے سے بندھی نہ رہ سکی تو سارا جگ اس کے لئے شاملاٹ ہو گیا۔[۲۹]

کچھ رشوتوں کی گرم بازاری، کچھ گفتگو کا مسکا پالش۔[۳۰]

ناول میں سے لئے گئے درج بالا اقتباسات میں سے کچھ رشوتوں کی گرم بازاری، کچھ گفتگو کا مسکا پالش جب گائے ایک کھونٹے سے بندھی نہ رہ سکی تو سارا جگ اس کے لئے شاملاٹ ہو گیا۔ یہ تمام نئی تراکیب و محاورات بانو قدسیہ کے اپنے وضع کردہ ہیں۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کہیں سے نہیں لگتا کہ مصنفہ نے ان کو زبردستی ناول میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بڑی روانی سے تحریر میں شامل ہیں۔ ناول میں بانو قدسیہ نے علاقائی زبان کے الفاظ، محاورات، لوک گیت اور کہاوتوں کا استعمال بکثرت کیا ہے۔

دو چار دن میں بھلی چنگی ہو کر وہ پھر دڑنگے مارنے کے قابل ہو گئی۔[۳۱]

ملازم، مزارعے، سیدانیاں، کاکے، کاکیاں ان کے دوست ہجولیوں کا پھیرا ٹورا تھا۔[۳۲]

جنرل صاحب ابھی بھی ہولے ہولے مونچھوں کو مرنڈا چڑھا رہے تھے۔ [۳۳]

ماں یوں بلبلا کر روئی کہ اس کا سارا انجر پنجر ڈھیلا ہو گی۔ [۳۴]

مصنفہ نے جو الفاظ و تراکیب ان جملوں میں استعمال کی ہیں جیسے بھلی چنگی، دڑنگے، کاکے، کاکیاں، پھیرا ٹورا، مرنڈا، انجر پنجر یہ تمام الفاظ مصنفہ کی پنجابی زبان اور مشرقی تہذیب سے اپنائیت کی دلیل ہیں بانو قدسیہ پنجابی زبان کے الفاظ، محاورات اور گیتوں کا استعمال بڑی شد و مد کے ساتھ اس ناول میں کرتی ہیں جو لوگ پنجابی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں ان کے لئے تو یہ الفاظ بڑی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن جو پنجابی زبان سے واقفیت نہیں رکھتے ان کے لئے سمجھنا تھوڑا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد ان کو سمجھا جا سکتا ہے علاقائی الفاظ و محاورات کا بکثرت استعمال مصنفہ کی اس زبان سے انسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز یہ علاقائی الفاظ و محاورات ہندوستانی تہذیب کو بھی اجاگر کرنے کا باعث بنتے ہیں اور اسلوب میں ندرت پیدا کرتے ہیں۔

آنگن کا نلکہ، نلکے سے بندھی لمبی ٹاکی،۔۔۔ کھرے میں پڑے جھونٹے برتن۔ [۳۵]

ان کے درمیان آڈ، منڈیر، وٹ کو بآسانی ٹاپا جا سکتا تھا۔ [۳۶]

بھینسوں کو نہلانا، چارہ کاٹنا، گوتاوا کرنا، چھڑی لے کر اجڑ کو گھر تک لے جانے کا بھی عادی ہو گیا تھا۔ [۳۷]

پھر اس نے پھکنی سے ایک لمبا سانس لکڑیوں پر چھوڑا اے ہے کیسی گیلی لکڑیاں ہیں—نرا پانی۔ [۳۸]

دیہی کلچر ہماری مشرقی تہذیب کا عمدہ عکاس ہے۔ مصنفہ نے ناول میں دیہی کلچر کے بارے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ دیہات کا ایک پورا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچتے ہیں۔ درج بالا جملوں میں کھرے میں پڑے جھونٹے برتن، آڈ، منڈیر، گوتاوا کرنا، اجڑ، پھکنی دیہی کلچر کو واضح کرنے والے الفاظ ہیں۔ اس کے علاوہ ناول میں پیڑھی، مدھانی، پینگ بھی دیہی کلچر کے نمائندہ الفاظ ہیں۔

بانو قدسیہ نے نے درج بالا علاقائی الفاظ و تراکیب کے ساتھ ہی ساتھ بعض علاقائی محاورات بھی ناول کے کرداروں سے ادا کروائے ہیں۔

سب کہیں گے ساجدہ نے یہ کھیہ سواہ گھولی۔ [۳۹]

بھس میں چنگی ڈال جمالو دور کھڑی۔۔۔ [۴۰]

درج بالا اقتباسات میں بانو قدسیہ نے علاقائی زبانوں کے الفاظ اور محاورات کو استعمال کیا ہے جو کہ عام فہم نہیں ہیں اور مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا کہنا ہے کہ مصنفہ کو چاہیے تھا کہ ان کی جگہ پر عام

فہم اور روز مرہ کے محاورے استعمال کرتیں۔[41] بانو قدسیہ کے اس ناول میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کی بہتات ہے ان میں سے چند الفاظ ملاحظہ کیجئے۔

اوپرا، وخت، مینا بر کی، اڈیکتی ، نرا، بچڑا، پیہا، ناواں، پھنڈر

زیر بحث ناول میں بانو قدسیہ نے بعض الفاظ ایسے بھی استعمال کیے ہیں جو کسی مخصوص علاقے میں بولے جاتے ہیں کسی مخصوص علاقے تک محدود ہونے کی وجہ سے ہر شخص ان الفاظ کے معنی نہیں جانتا لیکن اگر قاری سیاق و سباق پر نظر ثانی کرے تو بات سمجھ میں آنے لگتی ہے بعض الفاظ تو اس قدر اجنبیت کا باعث بنتے ہیں کہ ان کے معنی تلاش کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوپٹے کا کھیدو بنا کر پیروں سے ٹھڈے مارتا کبھی نہ ٹوکتیں۔۔۔[42]

ذرا یہ گراہیں ٹولہ دو چار دن میں رخصت ہو جائے۔۔۔۔۔ کہیں پہ کوئی اور پاکھنڈ نہ کریں۔۔۔[43]

پنجابی جوتی گرد سے اٹی تھی اور پھٹے ہوئے بائیں جوتے سے چیچی انگلی باہر کو سرک آئی تھی۔[44]

ساجدہ ماں نے سر پر دوہری بکل لے کر اسے پاس بلایا۔[45]

کھیدو، ٹھڈے، گراہیں ٹولہ، پاکھنڈ، چیچی اور بکل ایسے الفاظ ہیں جو عام قاری سمجھ نہیں سکتا جب تک اس زبان سے واقفیت نہ ہو۔

بانو قدسیہ نے ناول میں اردو کے رائج کردہ محاوروں کا استعمال بھی بکثرت کیا ہے۔ علاوہ ازیں مصنفہ کے اپنے بنائے گئے محاورے بھی ناول میں ہمیں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ مصنفہ رائج کردہ محاروں کو جوں کا توں استعمال کرنے کی بجائے انہیں الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہیں اس بارے میں جب ان سے پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا۔

> ایک بار ایک مشور اہل زبان شاعر نے مجھے کہا۔ آپ محاوروں کو الٹ پلٹ دیتی ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کے ہاتھوں کے طوطوں اور فاختاؤں سمیت بہت کچھ اڑ گیا۔ حالانکہ یہ خلاف محاورہ بات ہے اور اردو ادب میں اس کی کوئی سند نہیں ملتی۔ اس پر میں نے بے ساختہ جواب دیا کہ صاحب! جہاں تک سند کا تعلق ہے وہ اب دہلی اور لکھنؤ سے نہیں بلکہ داستان سرائے (بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کی رہائش گاہ) سے دی جایا کرے گی کیوں کہ تخلیقی ادب نہ صرف زبان کو نیا لہجہ بلکہ نئے محاورے بھی دیتا ہے۔[46]

بانو قدسیہ ناول میں خود سے سے محاورات بھی وضع کرتی ہیں اور پہلے سے رائج اردو محاورات کو بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ناول میں برتتی ہیں ناول میں مصنفہ نے اردو ادب کے جن مروّج محاورات کو استعمال میں لایا ہے وہ

درج ذیل ہیں—"میں نے ایک تصویر دیکھ کر کہا تھا۔۔۔دیکھو عین مین شوکت مغل کی تصویر۔"[47] عین مین ہونا سے مراد یہ ہے کہ بالکل اسی جیسا جوں کا توں ہونا۔ یہ محاورہ عربی زبان کے الفاظ سے بنا ہے۔ زیر بحث ناول میں جہاں یہ محاورہ استعمال ہو رہا ہے یہاں اس کا مطلب ہے کہ ہو بہو شوکت مغل کی طرح تصویر والا شخص دکھائی دے رہا ہے۔

اسی طرح ایک محاورہ ہے "ایک بار شوکت بھیا کی رضامندی کے بغیر ان کا کمرہ ٹھیک کہا تھا تو ایسی کر کری کی تھی انہوں نے اول تو کمرے سے ہی نکال دیا تھا"۔[48] کر کری کرنا سے مراد یہ ہے کہ بے عزتی کرنا یا بے عزتی ہونا اس کے معنی عزت میں کمی آئے یا وقار باقی نہ رہنے کے ہیں۔ ناول میں جہاں یہ محاورہ استعمال ہوا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بغیر اجازت کمرہ کی صفائی کرنے پر بھائی نے بے عزتی کی تھی۔

ناول میں سے ایک اقتباس جہاں بانو قدسیہ نے محاورے کا استعمال کیا ہے ذیل ہے۔"پہلی بار ساجدہ بیگم ڈر گئیں۔۔۔۔۔اندر ہی اندر لاحول پڑھتے ہوئے، اس نے ارادہ کی"۔[49] لاحول عربی زبان کا لفظ اور ایک کلمہ ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ عموماً اسے شیطانی خیالات اور وسوسے ذہن سے ختم کرنے کے لیے پڑھتے ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لاحول پڑھو تو طبیعت کا انتشار ختم ہو جاتا ہے ناول میں یہ محاورہ بانو قدسیہ اس جگہ استعمال کرتی ہیں جب ناول کے کردار ساجدہ بیگم کو شیطانی وسوسے گھیرتے ہیں تو وہ لاحول پڑھ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کرتی ہیں۔

اسی طرح ایک اور محاورہ ملاحظہ کیجیے۔"تو پلیز بیگم سرفراز۔۔۔فوراً اسی ارمان کو پورا کر لیں۔ وہ نہ ہو کہیں کوئی نئی مصیبت گل کھلائے۔"[50] گل کھلانا کا مطلب ہے کہ ایسی انوکھی بات کرنا کہ لوگ اس پر حیرت کا اظہار کریں کہ یہ کیا ہو گیا۔ ناول میں بھی اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی مصیبت گل کھلائے یعنی کوئی ایسا انوکھا واقعہ ہو جائے جس سے پریشانی ہو۔

بانو قدسیہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ اردو زبان کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتی تھیں۔ ناول میں مصنفہ نے انگریزی زبان کے الفاظ کو بڑے احسن طریقے سے برتا ہے۔ انگریزی زبان کو ناول کی زبان کا حصہ بناتے وقت کہیں سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ شعوری طور پر ان الفاظ کو ناول کے متن میں شامل کر رہی ہیں انگریزی زبان کے الفاظ تو اب اردو زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ مصنفہ ان الفاظ کو ہو بہو بھی اور اردو رسم الخط میں بھی ناول کی زبان کا حصہ بناتی ہیں۔ بانو قدسیہ نے زیر بحث ناول میں انگریزی الفاظ کو اردو رسم الخط میں استعمال کیا ہے ناول میں سے اقتباس ذیل ہے ''پولیٹکس ڈسکس کرنا منع ہے''ناول میں کثیر تعداد میں انگریزی الفاظ اردو میں استعمال گئے ہیں۔ چند الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

کرٹن کال، ہاؤمین، گٹ آؤٹ آف دی کلاس، الاٹ منٹ، ان ڈور گیمز،
پوسٹ آفس، تھرڈ ورلڈ، وی فار وکٹری، پبلک لائبریری، آئی ایم سوری۔

مصنفہ نے انگریزی زبان کے الفاظ کو اردو رسم الخط کے علاوہ انگریزی زبان کے الفاظ میں بھی جوں کا توں استعمال میں لایا ہے۔

> کر دیا گیا ہے Mould کا کرشمہ ہے۔ صدیوں سے عورت کو ایسے Opinion پھر یہ بھی پبلک
> She will کے خلاف بغاوت کر چکی ہے"۔۔ Institution۔۔۔۔۔عورت پہلے بھی اس
> do it Again کا احترام نہ کیا تو Opinion اگر آدمی نے عورت کی Soon
> Enough .He will have enough of sea but no homes no children no family! May be no love as well. [۵۱]

اس کے علاوہ بھی ناول کی زبان میں انگریزی الفاظ کی بہتات ہے چند الفاظ ناول میں سے یہ ہیں۔

Democracy, Chromosome Grow Compete، Skin Pack, Constitution, Incarnate Phenomena, Recycle, Dependency, Trauma

بانو قدسیہ کا انداز معلوماتی ہے وہ ہر چیز کے بارے میں پہلے معلومات فراہم کرتی ہیں پھر ہی بات کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ناول کی زبان میں مصنفہ کے معلوماتی انداز کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مثال مرغی سے مشابہ ایک پہاڑی پرندہ ہے اس کی مشابہت اس درجہ ہے کہ عام لوگ اسے پہاڑی مرغی ہی سمجھتے ہیں اس کی کلغی بڑی خوبصورت اور واضح گہرے سبز سنہری اور فیروزی پر بڑے چمکدار ہوتے ہیں۔ اتنے چمکدار کے مصنوعی دکھائی دیتے ہیں۔ [۵۲] ناول میں کچھ معلومات ایسی بھی ہیں جنہیں پڑھ کر لگتا ہے کہ بانو قدسیہ نے یہ کسی کتاب سے اکتساب کی ہیں۔

> کہیں کسی انگریزی کتاب میں اس نے پڑھا تھا کہ ہوا آکسیجن اور کاربن کا مجموعہ ہے۔ یہ ہوا یوں ہی جامد رہ سکتی ہے۔ لیکن جوں ہی اس میں ہائیڈروجن ملتی ہے تو تبدیلی آتی ہے پانی کا قطرہ بنتا ہے اب اس قطرے میں کئی امکانات ہیں۔ اس میں زہر ملا کر بھی پلایا جا سکتا ہے اور اس میں مرے آدمی کو دوا ملا کر بھی دی جا سکتی ہے۔ جب تک تیسرا عنصر شامل نہ ہو کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ [۵۳]

بانو قدسیہ ناول کی کہانی کو کرداروں کے ذریعے بیان کرتے وقت جو بھی واقعات بیان کرتی ہیں۔ ہر چیز کی تفصیل کے ساتھ پہلے معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا اس بارے میں کہنا ہے کہ مصنفہ کی یہ

فطرت ہے کہ وہ ہر چیز کی سائیکی پر بحث کرتی ہیں اور اس کے بعد ہی آگے بڑھنا پسند کرتی ہیں اب وہ درخت، عمارت اور ہاسٹل ہی کیوں نہ ہو۔[۵۴] جیسے کہ ناول میں بانو قدسیہ پھولوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے درخت کا تفصیلی ذکر کرتی ہیں—"آؤ کینتھ کے پھول توڑیں۔۔۔۔ کینتھ کا درخت آلوچے کے درخت کی طرح درمیانے سائز کا ہوتا ہے۔اس میں آڑو، آلوچے جیسے سفید پھول بے تحاشہ لگتے ہیں۔دور سے پھول کاغذی نظر پڑتے۔[۵۵]

بانو قدسیہ جب بھی کسی چیز کا ذکر کرتی ہیں تو وہ سرسری انداز میں نہیں کرتی بلکہ بات کی تہہ میں جاتی ہیں درج بالا مثال میں مصنفہ آلوچے کے درخت کی پوری تفصیل بیان کرتی ہیں کہ یہ درخت ظاہری صورت کیسی رکھتا ہے اور اس کے پھول کس قسم کے ہیں ان تفصیلات کو بیان کرنے کے بعد ہی بات کو آگے بڑھاتی ہیں ناول میں سے ایک ایسا ہی اقتباس ملاحظہ کریں جس میں مصنفہ تفصیلی معلومات فراہم کرتی ہیں۔

> چمبہ ریاست میں سورج بنسی راجپوت آباد تھے۔۔۔۔ پرانے راجپوت گھرانوں میں جو چتوڑ سے وابستہ تھے، سیہیا سی لگانے کا رواج تھا۔ورمن سے مراد ڈھال ہے اور پالا تحفظ کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔دیو یا دیوی کا لفظ بھی اپنے نام کے ساتھ لگانے کا رواج رہا اور جب دو راجے باہم ملتے تو آپس میں جے دیو کہہ کر ایک دوسرے کا سواگت کرتے اگر راجوں کا سٹیٹس برابر نہ ہوتا تو عام طور پر رام رام کہہ کر گزر جانے کا رواج تھا۔۔۔۔ نیچ ذاتوں کے سواگت کا جواب دینا معیوب بات خیال کی جاتی تھی۔[۵۶]

بانو قدسیہ نفسیات کی طالب علم تھیں۔ان کی انسانی نفسیات سے دلچسپی ایک فطری بات ہے۔ناول میں عورت اور مرد کی نفسیات کو جس باریک بینی سے بیان کرتی ہیں۔وہ ان کی وسعت مطالعہ کا ثبوت ہے۔زیر بحث ناول میں بانو قدسیہ کا مرد اور عورت کے بارے میں ایک قول ہے کہ "مرد اور عورت چکی کے پاٹ بن کر ایک دوسرے کو پیستے چلے جاتے ہیں" [۵۷]

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی بانو قدسیہ کی مرد اور عورت کی نفسیات میں دلچسپی کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> بانو قدسیہ کو مرد اور عورت کے رشتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا بڑا شوق ہے وہ جگہ جگہ عورت اور مرد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔مرد و زن کے تعلق سے کئی جملے اتنے قطعی اور غیر مذبذب ہوتے ہیں کہ انہیں الگ سے ترتیب دیا جائے تو کسی مفکر کے اقوال زریں معلوم ہوں گے۔۔[۵۸]

بانو قدسیہ کی نگاہ سماجی و معاشرتی مسائل پر بڑی گہری تھی وہ سماجی حالات کا بغور مطالعہ کرتیں اور ان کو اپنی تحریروں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتتی تھیں۔مصنفہ ان حقائق کو خوبصورت الفاظ میں ڈھال کر بڑی عمدگی سے

اس کی تصویر کشی کرتی جو مصنفہ کے معاشرے پر گہری نظر کے غماز ہیں۔ معاشرے کے تلخ حقائق کو خوبصورت الفاظ کا لبادہ پہنا کر اس قدر خوبصورتی سے ناول میں برتنا بانو قدسیہ کا ہی طرہ امتیاز ہے۔ عشرت رحمانی اس ضمن میں کہتی ہیں۔مسائل کی تشکیل میں ان کے گہرے انسانی مطالعہ ومشاہدہ کو بڑا دخل ہے جس میں خارجی کیفیات اور داخلی عوامل دونوں باہم پیوست نظر آتے ہیں۔[۵۹] ناول میں سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ساری بدی انسان میں اس کے پیٹ کے راستے سے داخل ہوتی ہے۔ جو لوگ صرف کھانے پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ساری خواہشات کو قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ پہلے آدمی کا معدہ جاگتا ہے پھر۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھ ہوس کا شکار ہوتی ہے۔۔۔۔ جب آنکھ قابو میں نہیں رہتی تو پھر جنس حملہ آور ہوتی ہے۔۔[۶۰]

ناول میں بانو قدسیہ کا لب ولہجہ روحانی ہو جاتا ہے اور ان پر فلسفیانہ رنگ غالب آجاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ کسی مبلغ کی طرح وعظ و نصیحت کر رہی ہیں۔ زیر نظر ناول میں جگہ جگہ مصنفہ قاری کی ذہنی تربیت کر رہی ہیں۔ بانو قدسیہ ناول کی زبان میں جگہ جگہ نصیحتیں کرتیں اور اخلاقی سبق دیتی دکھائی دیتی۔ ڈاکٹر انوار احمد بانو قدسیہ کے وعظ و نصیحت کے بارے میں کہتے ہیں:

> اشفاق احمد اور بانو قدسیہ میں ایک مشترکہ کمزوری ہے کہ دونوں نظریہ ساز بننے کی کوشش کرتے ہیں اس میں شک نہیں کے ہر تخلیق کار اپنا ایک تصور حیات اور تصور انسان رکھ سکتا ہے مگر فنی قباحتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب آپ واعظ کے منصب پر فائز ہو جائیں۔[۶۱]

ناول میں بانو قدسیہ جگہ جگہ اپنی ذاتی رائے پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ کسی قسم کے بھی حالات و واقعات ہوں بانو قدسیہ وعظ و نصیحت کرتی نظر آتی ہیں۔ بات بات پر مصنفہ کا نصیحتی انداز ناول کی زبان کو خشک بنا دیتا ہے۔ ناول میں سے ایک ایسا ہی اقتباس ملاحظہ کریں:

> خود جینا اسی وقت ممکن ہے جب آدمی دوسرے کو جینے کا حق عطا کرتا ہے۔ جب بھی آپ دوسروں کو قید کرتے ہیں۔ رد عمل کے طور پر خود قید ہو جاتے ہیں۔۔۔ مل جل کر رہنا اسی وقت ممکن ہے جب دوسروں کی آزادی، ان کے حقوق پامال نہ کئے جائیں۔۔۔۔[۶۲]

ناول میں اکثر جگہوں پر بانو قدسیہ کا لب ولہجہ روحانی ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ روحانیت کا پرچار کرتے ہوئے نظر آتی ہیں وہ معاشرے کو ایک دم اجلا اور صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہیں عبدالوحید اس ضمن میں کہتے ہیں۔ وہ ایک ماں کی طرح ہیں جو اپنی باہیں پھیلا کر معاشرے کی طرف بڑھ رہی ہیں۔[۶۳] ناول میں سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> اگر نیت درست ہوئی تو کوئی عمل برا نہیں اور جو کہیں نیت میں فتور ہوا تو پھر ہاویہ زاویہ ہے۔۔۔۔۔

جانچے جاؤگے پرکھے جاؤگے اور سزا پاؤگے۔ [۶۴]

ناول میں غیر ضروری طوالت، ہر چیز کے بارے میں تفصیل بیان کرنا ناول کی زبان کو خشک بنا دیتا ہے۔ ایجاز واختصار ہی کسی فن پارے کی خوبی تصور کی جاتی ہے مگر زیر نظر ناول میں بانو قدسیہ ہر بات کو بہت زیادہ طول دیتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی:

> ان لمبے لمبے بیانات کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصنفہ ہر بات کی گہرائی میں جا کر اس کی نفسیاتی وجوہ تلاش کرتی ہیں اور پھر ان وجوہات کو دلائل کے ساتھ قاری تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ [۶۵]

ناول میں کانگڑہ ویلی کے بارے میں بتاتے ہوئے پانچ صفحات کی تفصیلی گفتگو کرتی ہیں اس قدر تفصیلی گفتگو سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بانو قدسیہ جب تک کسی بھی چیز کی وضاحت بیان نہیں کر لیتیں بات کو آگے نہیں بڑھاتیں۔ ناول میں سے اس کی مثال ذیل ہے۔ بات آگے بھی نہ بڑھ سکی کیونکہ راحیلہ ان دونوں کو منال (پرندہ) دکھانے لے بھاگی۔۔ [۶۶] مصنفہ منال کہہ کر ہی بات کو آگے بڑھا سکتی تھیں۔ انہوں نے بریکٹ میں (پرندہ) لکھ کر وضاحت دینا مناسب سمجھا کہ جو لوگ نہیں جانتے کہ منال کیا ہے ان کو سمجھ آسکے کہ منال ایک پرندہ ہے۔ بقول ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی :

مصنفہ کے تفصیلی بیانات کے بارے میں میں کہتے ہیں مصنف کو اختصار اور ارتکاز کا فن بالکل نہیں آتا۔۔۔۔۔ وہ نذیر احمد کی طرح لمبے لمبے تعلیمی اصلاحی بیانات اور نصیحتوں سے دامن نہیں چھوڑا سکیں یہ بیان کی صفوں پر مشتمل ہیں اور اس قدر بور ہیں کے قاری اگر کئی صفحے پلٹ کر بھی ناول پڑھتا ہے تو اسے کسی کمی یا تشنگی کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی قصے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ [۶۷]

ایک ایسی ہی تفصیلی گفتگو جو مصنفہ نے نفس کے بارے میں کی تحریر کو بور بنا دیتی ہے ناول میں سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> نفس کی نچلی ترین سطح نفس حیوانی ہے جہاں بندہ جانوروں کی طرح حواس خمسہ کے سہارے فقط اپنی اجتہا کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ کھانے کو چاہا کھا لیا۔ کسی کے ساتھ سونے پر راضی ہوئے تو سو لیا۔ چھین جھپٹ کر اپنی بات منوالی۔۔۔۔۔ نفس کی دوسری سیڑھی نفس امارہ ہے۔ یہاں خواہشات حیوانی سطح پر نہیں ہوتی لیکن مکمل طور پر انسان کے اعمال و افعال پر خواہش کا دور دورہ ہوتا ہے۔ خواہشات کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتیں۔ ایک پوری ہوتی ہے تو ترنت ہی دوسری جنم لے لیتی ہے

۔۔۔۔۔ خواہشات کی ایک فصل کٹ چکتی ہے تو دوسری پنیری سر نکال لیتی ہے۔ نفس کی تیسری سیڑھی نفس لوامہ ہے۔ یہاں کشمکش کا دور دورہ ہوتا ہے۔۔۔۔ عموماً نفس کا یہی مقام ہے۔ جہاں انسان ذہنی مریض بنتا ہے۔۔۔۔ نفس لوامہ ہی سے مرشد نکالتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں دماغ کے سیاہ نقطے سے روح کو ہدایت ملتی ہے۔ اللہ کی توفیق، انسان کی اپنی استعداد اور مرشد کی منشا شامل ہو تو پھر مرشد بہت جلد ذکر، فکر، شغل، استغراق، ریاضت سے پہلے تو مرید کو یکسوئی عطا کرتا ہے اس سے کثیر المقاصد منزلیں ہٹا دیتا ہے۔[۶۸]

بانو قدسیہ شہر لازوال ، آباد ویرانے میں منظر کشی بڑی عمدگی سے کرتی ہیں ان کے اس ناول میں دیہی زندگی، شہری زندگی، طوائف کی زندگی، جاگیر دارانہ نظام، ہجرت کے وقت لٹے پٹے لوگوں کی داستان، قیام پاکستان سے پہلے مشترکہ ہندوستانی تہذیب ان تمام مناظر کو مصنفہ پوری جزیات کے ساتھ ناول میں پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مصنفہ منظر کو بیان کرتے ہوئے برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو بھی پوری جزئیات کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں جب بہت سی اقوام مل جل کر رہ رہی تھیں اس دور کی اقدار، روایات کو بڑی باریک بینی سے ناول میں بیان کرتی ہیں۔

امرتسر میں لمبی چوڑی کلچرل لائف تھی، عید، شب برات، میلاد، محرم سب تہوار زندہ تھے۔ گھروں میں عہد کریمہ ہوتا تو سوا لاکھ کھجوری گٹھلیاں فٹ پڑھی جاتیں۔۔۔ ایک گھر میں میلاد ہوتا تو ساری گلی میں اگربتی، گلاب کے عرق کی خوشبو پھیل جاتی۔[۶۹]

ناول میں منظر نگاری کو ایک خاص مقام حاصل ہے اگر منظر نگاری عمدگی سے کی گئی ہو تو وہ ناول قاری کے لئے دلکش ہوتا ہے۔ مصنفہ کو منظر کشی میں اوج کمال حاصل ہے۔ وہ پوری جزئیات کے ساتھ کوئی بھی منظر ناول میں پیش کرتی ہیں۔ مصنفہ کی زبان میں یہ خوبی ہے کہ وہ جو بھی منظر ناول میں پیش کرتی ہیں وہ اس قدر جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں کہ قاری اس منظر کو اپنے سامنے چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے ان مناظر کو پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ بانو قدسیہ کس قدر باریک بینی سے ماحول کا مشاہدہ کرتی تھیں۔ ناول کے ایک کردار جنرل بختیار کی کوٹھی کے منظر کو مصنفہ پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

دیواروں پر سدا بہار بیلیں چڑھی تھیں۔ لمبی لمبی شیشیوں والی کھڑکیاں اور ان کے اندر نامعلوم رنگوں والے چمکنے والے رنگوں کے بھاری پردے۔ چمکدار موزیک کے فرش، لان کے ارد گرد تین طرف گلاب کی کیاریاں، گل چین کے درخت، ڈرائیوے پر اونچے اونچے فانوس، پوپلر کے درخت جن میں نئی بہار نے پتوں کی ایک بالکل نرم و نازک کھیپ بسا دی تھی۔[۷۰]

زیر بحث ناول شہر لازوال ، آباد ویرانے میں بانو قدسیہ نے دیہی کلچر کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے -ناول میں مصنفہ نے دیہات کی زندگی، ان کی سرگرمیوں، عادات، رواج، کھیت کھلیان، رہن سہن کی پوری جزئیات کے ساتھ ایسی منظر کشی کی ہے کہ ناول پڑھتے وقت گاؤں کا کلچر آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بانو قدسیہ کی جزئیات نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں وہ ناول کی جزئیات کو اس طرح مرتب کرتی ہیں کہ سب کچھ حقیقی اور سچا نظر آئے۔[۱] دیہات کے لوگ آج بھی برصغیر کے تہذیبی نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ شرم و حیا، مہمان نوازی، لحاظ مروت دیہاتوں میں آج بھی زندہ ہے -ناول میں ان تہذیبی اقدار و روایات کو گاؤں کی زندگی میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ بوڑھوں کو دیکھ کر نوجوان راستہ چھوڑ دیتے ہیں ایسا صرف دیہاتوں میں ہوتا ہے۔ شہروں میں یہ روایات دم توڑ چکی ہیں۔

> جس گھر میں شوکت مغل اور بشریٰ رہے ایک پرانا سا گھر تھا۔ چاروں طرف پاتیوں جیسے کمرے تھے۔ آگے برآمدے اور درمیان میں کھلا صحن اس صحن میں جا بجا چھوٹے چھوٹے بیری، نیم اور دھریک کے درخت تھے۔ ٹوٹے اور ثابت تخت پوش، مٹی کے چولہے، چولہوں پر رکھے بڑے بڑے توے جن پر آٹھ دس روٹیاں ایک بار پک جاتی تھیں۔ آنگن میں سارا دن روٹی پکتی، دانے پھٹکے جاتے، اناج کی بوریاں آتی جاتیں۔ پرانے تخت پوشوں پر کھیس دریاں بچھائی اٹھائی جاتیں۔ کہیں سے بچے اگر صحن میں کھیلتے اور شور مچانے لگتے۔ رسی ناپی جاتی، روڑے مار مار کر بیر اتارے جاتے۔۔۔۔ وہ تن تنہا کھیتوں میں نہر کنارے سروٹوں کے ارد گرد جہاں چڑیاں جھولتی رہتیں، پھرتا رہتا۔۔۔ گرگٹ، چڑیاں بلبلیں اس کی آہٹ پا کر ٹل جاتے۔۔۔۔۔ دودھیل گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں۔۔۔ بکروال جب بکریوں کے اجڑے کر گزرتے۔۔۔ گاؤں کی لڑکیاں آنکھیں جھکائے اسے سلام کر کے راستہ چھوڑ دیتیں۔[۲]

قیام پاکستان کے وقت جو حالات تھے۔ بانو قدسیہ اس کی چشم دید گواہ تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے مصنفہ بھارت میں رہتی تھیں۔ ہندو مسلم پڑوسیوں کی طرح ساتھ ساتھ رہ رہے تھے لیکن اندر ہی اندر تعصب ان کو کھائے جا رہا تھا۔ جس کا وہ بظاہر اظہار نہیں کرتے تھے۔ جوں ہی تقسیم کا اعلان ہوتا ہے۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ انسانی جانوں کو بے دریغ قتل کیا جاتا ہے۔ بانو قدسیہ اس ناول میں ان حالات کی منظر کشی بہت کمال کی کرتی ہیں اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ یہ ان کے ذاتی زندگی کے حالات تھے۔

> پھاٹکوں سے بلوائی داخل ہوئے۔ ٹھاٹھیں مارتا ایک سمندر تھا جس میں ماتھے پر قشقہ کھینچے ہندو تھے اور ساتھ ہی ہاتھوں میں کرپانیں، پستولیں لئے سکھ بھی تھے۔۔۔ جلد ہی شامیانے الٹ گئے۔ عورتیں،

بچے لڑکیاں چیخیں مارتی ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ مردوں نے کرسیوں، میز دیگ کے چمچوں سے یہ وار سہے۔۔۔۔ عورتیں اپنے بال کھسوٹ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں۔ مہندی کے کھانے کی خوشبو اور انسانی لہو کے دھبے دور دور تک مارا مارا کر رہے تھے۔[۴۳]

تقسیم ہند کا واقعہ برصغیر ہی کے نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا واقعہ تھا۔ صدیوں پرانی برصغیر کی تہذیب بکھر کر رہ گئی۔ ناول میں مصنفہ برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے لوگوں کے رسم و رواج، شادی بیاہ کی بھی منظر کشی کرتی ہیں۔ مہندی کی رسم برصغیر کے قدیم دور میں بھی کی جاتی تھی اور آج بھی یہ رسم کی جاتی ہے۔ ناول میں مہندی کی رسم کو مصنفہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ کے ہاں تشبیہات و استعارات کا بر محل استعمال اور ان میں ندرت پائی جاتی ہے۔ مصنفہ کو مناظر قدرت اور ارد گرد کی چیزوں سے نئی نئی اصطلاحات بنانے کا بہت شوق تھا اس کا اظہار وہ ناول میں جگہ جگہ کرتی ہیں۔ اس ناول میں مصنفہ نے انسانی جذبات و احساسات کو بھی تشبیہات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں کہتے ہیں - ان کی تشبیہات ان کے ذاتی مشاہدے سے پھوٹی تھیں۔[۴۴] جدید روزمرہ کی چیزوں سے بنائی گئی تشبیہات کی چند مثالیں ذیل ہیں:

ان گنت باتیں یوں رول رول کر دھلتی رہتی تھیں جیسے واشنگ مشین میں گندے کپڑے۔[۴۵]

پھول و نتی کا چہرہ باسی چائے کی طرح بدرنگ ہو گیا۔[۴۶]

اس کے کانوں کے ہیرے موتی پینگوں کی طرح جھولنے لگے۔[۴۷]

محاوروں کی طرح تشبیہات میں بھی مروج چیزوں کو برتنے کی بجائے بانو قدسیہ تخلیقی انداز اپناتی ہیں۔ جدید دور کی چیزوں سے نئی نئی تشبیہات وضع کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر مصنفہ کی تشبیہات کی بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی تشبیہیں دوسروں سے بالکل منفرد اور الگ قسم کی ہوتی ہیں- وہ پیش پا افتادہ اور مستعمل تشبیہیں ہر گز استعمال نہیں کرتیں بلکہ جدید، موڈرن اور عصر حاضر کی روزمرہ چیزوں سے اخذ کرتی ہیں۔[۴۸]

بانو قدسیہ نے بعض تشبیہات بہت ہی انوکھی بنائی ہیں جیسے کہ

دونوں ایک دوسرے کے لئے اتنے بے ضرر ہو گئے جیسے مٹر کی پھلی کے اندر رہنے والے مٹر کے دانے۔[۴۹]

ننھی بوندوں کی پھواریں پڑ رہی تھی جیسے آسمان پر حوریں بیٹھی سوجی پھٹک رہی ہوں۔[۵۰]

سوئے ہوئے مگرمچھ کی طرح وہ اپنی ازدواجی زندگی میں مگن تھی۔[۸۱]

ناول میں جابجا بانو قدسیہ تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال کر کے نثری عبارت کو بھی شعری آہنگ دیتی ہیں۔ان سے شاعرانہ حسن پیدا ہو جاتا ہے۔جو ناول کو مزید دلکش بنانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ان کے مشاہدے اور فن کا جوہر ان کی تشبیہات واستعارات میں کھلتا ہے ان کی بیشتر تشبیہات، نفسیاتی نوعیت کی ہیں اور یہ کردار نگاری میں ان کی معاونت کرتی ہیں۔اور یہ حقیقت تسلیم کرنا ضروری ہے کہ بانو قدسیہ کا مشاہدہ وسیع ہے اس لئے ان کی تشبیہات بھی متنوع اور تخلیقی ہیں۔[۸۲]

کوئی بھی فن پارہ تبھی تخلیق ہو سکتا ہے جب مصنف باریک بین ہو اور اس کا مشاہدہ بھی وسیع ہو۔پھر ہی وہ کوئی اچھی تخلیق پیش کر سکتا ہے۔مصنفہ کے ناول کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تبھی خود سے چیزیں وضع کرنے کے قابل ہوئی تھیں۔کیونکہ ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا۔اور وہ چیزوں کا گہرائی میں جا کر مطالعہ کرتی تھیں۔بانو قدسیہ کے نئے تشبیہات واستعارات وضع کرنے سے اردو زبان کو ایک نیا پن ملتا ہے اور جدت پیدا ہوتی ہے۔نئے الفاظ وتراکیب جو بانو قدسیہ کے اپنے وضع کردہ ہیں ناول میں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

> سان فرانسسکو کی امپائر بلڈنگ تھی شاہنی۔[۸۳]
>
> بالائی جیسے اوپر والے ماحول میں۔[۸۴]
>
> جھاڑیاں بارش میں یوں بکھر رہی تھیں گویا کسی ساؤتھ انڈین کا بڑا سا جوڑا کھلنے کو ہو۔[۸۵]

بانو قدسیہ اپنے ماحول کا گہرائی سے مشاہدہ کرتی اور ان حالات وواقعات سے منفرد تشبیہات وضع کرتی تھیں ان کی منفرد سوچ کی عکاس یہ تشبیہات ہیں۔

> آگ دھوئیں کا تعاقب ایسے کر رہی تھی جیسے کوئی اوباش مرد عورت کو تنہا پا کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔[۸۶]
>
> یہ جگہ تو پھر جرائم، کرپشن، اقربا پروری سے پر ہو جائے گی جیسے باسی انجیر کے اندر ننھے ننھے کیڑوں کی بھرمار ہوتی ہے۔[۸۷]

ادب مختلف عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔تکنیک وہ طریقہ کار ہے جس میں کوئی بھی فن کار اپنے موضوع کو کسی طریقے سے پیش کرتا ہے شفیق الرحمن کا کہنا ہے کہ تکنیک مواد کی پیشکش کا نام ہے۔[۸۸] دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کہ مواد کو کسی خاص انداز میں میں متشکل کرنا تکنیک ہے کوئی بھی فن پارہ تخلیق کرنے سے پہلے اس کا

لکھاری سوچتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کو کس انداز میں پیش کرے۔مواد کی پیشکش کے لیے وہ بیانیہ، علامتی، خط، ڈائری کس انداز میں موضوع کو پیش کرے گا یہ طریقہ کار تکنیک کہلاتا ہے۔

ادب میں ہر دور میں مختلف تجربات کیے جاتے رہے ہیں۔فلیش بیک کی تکنیک، خود کلامی کی تکنیک، شعور کی رو کی جیسی مروج تکنیکات بھی جب پہلی بار برتی گئیں تو اجنبیت کا باعث بنیں تھیں آہستہ آہستہ یہ ادب میں رائج ہو گیئں۔ضروری نہیں ہے کہ مروج تکنیکات ہی برتی جائیں لکھاری کوئی بھی تکنیک اپنی تحریروں میں استعمال کر سکتا ہے۔اس حوالے سے مقبول و معروف ناول نگار رضیہ فصیح احمد کا کہنا ہے:

> اصل مقصد تو زندگی کی ترجمانی اور ناول کا بھرپور تاثر ہی ہونا چاہیے۔اس مقصد کو حاصل کرنا ہی تکنیک کا کام ہے۔ اسی طرح تکنیک کو یکجا کر کے تکنیک کے تنوع کو بھی واضح کیا جاتا ہے۔لیکن اس بات کو نظر میں رکھنا چاہیے کہ کہ ناول نگاروں کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی تکنیک لازمی نہیں ہے۔ہر لکھنے والا آج بھی کوئی نئی تکنیک اختیار کرنے میں پوری طرح آزاد ہے۔[۸۹]

بانو قدسیہ نے بھی زیر بحث ناول میں تکنیک کے تجربات کیے ہیں۔وہ اردو ادب میں رائج تکنیکوں کا استعمال بھی بخوبی کرتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ تکنیکی اور فنی لحاظ سے اس ناول میں مختلف تجربات بھی کیے ہیں۔جس طرح انسان کے تصورات بدلتے رہتے ہیں، زندگی میں تبدیلیاں آنے سے اقدار بھی بدلنے لگتی ہیں ویسے ہی تکنیک میں بھی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> تکنیک کے اصول بھی اٹل نہیں۔ادب اور فن کی مختلف اصناف کی تکنیک ہر دور اور ہر زمانے میں تغیرات کے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے۔یہ تغیرات حالات و واقعات کی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔جب حالات و واقعات میں انقلاب انگیز تبدیلیاں ہوتی ہیں..... تو یہ تبدیلیاں تکنیک اور فن میں نمایاں ہوتی ہیں۔[۹۰]

زیر بحث ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں بانو قدسیہ نے ناول کے دو حصے بنائے ہیں۔پہلے حصے کا عنوان شہر لازوال ہے، اس حصے میں دو کہانیاں ہیں، پہلی کہانی شہر لازوال کے عنوان سے ہے جو ۴۵ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کہانی ہے۔دوسری کہانی کاشف کی کہانی ہے یہ اگر ناول میں شامل نہ بھی ہوتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تیسری کہانی آباد ویرانے کے نام سے ہے۔اس حوالے سے سے ڈاکٹر اقلیمہ ناز اپنے مقالے میں لکھتی ہیں۔تکنیکی اعتبار سے بانو قدسیہ نے اپنے آخری ناول شہر لازوال آباد ویرانے میں انوکھی اختراع کی ہے بانو قدسیہ نے اس ناول کے شروع میں دو کہانیاں ایسی بھی شامل کی ہیں جن کا اصل کہانی جو کہ آباد ویرانے کے نام

سے ہے کوئی تعلق نہیں۔[۹۱] بانو قدسیہ نے یہ انوکھی اختراع ناول میں کیوں اپنائی، اس حوالے سے سفینہ بیگم اپنے ایک مضمون مابعد جدیدیت اور بانو قدسیہ (شہر لازوال ،آباد ویرانے) کے حوالے سے، میں لکھتی ہیں شہر لازوال میں موجود کسی بھی کردار کا تعلق آباد ویرانے کے کسی بھی واقعہ سے نہیں ہوتا ہے-اب اس کو ناول کے فنی تجربہ سے تعبیر کیا جائے۔۔۔۔آباد ویرانے paradoxical ترتیب ہے-ایک ایسا قول جو بظاہر تو غیر یقینی اور غلط معلوم ہو لیکن شاعر یا مصنف کے عندیہ میں وہ درست ہو اور غور کرنے پر اس کی معنویت اجاگر ہو جائے-اسی امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفہ نے یہ ترکیب استعمال کی ہے-[۹۲] بانو قدسیہ نے اس ناول میں موضوعات کو بھی بالکل ایک نئے انداز میں ترتیب دیا ہے اور واقعات کی ترتیب میں بھی انوکھا تجربہ کیا ہے کہ تمام واقعات کی ترتیب بالکل متضاد رکھی ہے-ناول کی تینوں کہانیوں کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے-ناول پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا تھا کہ آخر میں میں ان تینوں کہانیوں میں مصنفہ کوئی تعلق پیدا کریں گی لیکن ناول کے اختتام پر ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا-ڈاکٹر انوار احمد مصنفہ کی اس تکنیک کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> تکنیکی اور فنی اعتبار سے اس ناول میں کچھ حصے بنائے گئے ہیں-شہر لازوال، کاشف کی کہانی اور پھر آباد ویرانے جو دراصل اس ناول کا اصل حصہ ہے جو صفحہ ۶۹ سے ۵۷۶ تک محیط ہے، مگر یہ ایک دوسرے سے بے تعلق ہیں اور یوں احساس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شاعر مشاعرے میں ایک غزل سے پہلے اپنے دو قطعات پیش کرتا ہے-اسی طرح سے شاید اب کسی ناول سے پہلے دو کہانیاں بھی شامل کی جاسکتی ہیں سو شہر لازوال اور کاشف کی کہانی کا ناول میں وہی درجہ ہے، ناول کے اختتام پر توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ کسی طرح پلٹ کر اس کے ابتدائی دو ٹکڑوں سے کوئی معنوی ربط بنانے کی کوشش کریں گی۔[۹۳]

بانو قدسیہ نے جہاں اس ناول میں نئے نئے تجربات کیے ہیں وہیں اردو کی مروج تکنیکات کا بھی استعمال کیا ہے-ناول میں جابجا ہمیں فلیش بیک تکنیک کا استعمال نظر آتا ہے-فلیش بیک تکنیک ایک ایسا طریقہ کار ہے جس میں ناول میں کوئی منظر چل رہا ہو اور اچانک ہی ناول کا کردار ماضی کے واقعات کی طرف لوٹ جاتا ہے یعنی ماضی میں کرداروں کو جو واقعات درپیش آئے ان کا بیان فلیش بیک تکنیک ہے-زیر بحث ناول میں مرکزی کردار راحیلہ کے ہاں اس تکنیک کا استعمال بھرپور طریقے سے نظر آتا ہے-راحیلہ کا کردار ایک ایسی لڑکی کا کردار ہے جو قیام پاکستان کے وقت اپنے گھر والوں سے بچھڑ جاتی ہے-رفیوجی کیمپ سے اسے ایک نیک دل ڈاکٹر اپنے گھر لے آتا ہے اس گھر میں اس کو ضرورت کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے لیکن وہ ہر وقت ماضی کی یادوں میں کھوئی رہتی ہے-ناول میں سے اقتباس ملاحظہ کیجئے:

ان بہاریہ دنوں میں اسے سب اچھے لگتے تھے..... ساجدہ ماں،ابا۔۔۔دادا ابا۔۔۔۔ تسنیم، کوکو۔۔۔۔۔سب ھی اچھے تھے-سب ہی پیارے تھے- حتی کہ اسے عابدہ بھی ان دنوں میں بری نہیں لگتی تھی-ان ہی دھنک سپنوں کے دنوں میں ایک روز وہ تسنیم آپا کے ساتھ لان پر ٹہل رہی تھی اسے احساس تھا کہ اس دلفریب شام کو مکمل بنانے کے لیے تسلیم آپا کا وجود کافی نہیں۔۔۔۔ادھر تمنا کی، دعا ہوئی کوئی اور شگوفہ پھول بن کر کھل اٹھا-اس وقت راحیلہ نے دو چکر بھی نہ لگائے تھے کہ باڑھ ٹاپ کر شاہد بہار کا پیامی بن کر آ گیا-زندگی پہلی بار راحیلہ کے اندر فوارہ بن کر اچھلی-[۹۴]

بانو قدسیہ نے اس ناول میں حکایت کی تکنیک کو بھی استعمال میں لایا ہے-مصنفہ ناول کے کرداروں کو کسی نہ کسی عہد قدیم کے واقعے، تمثیلی قصے کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتی ہیں-ناول میں سے اقتباس زیل ہے یہ کوٹھری کسی تپسوی کے لئے اچھی رہتی جو ایک جگہ آسن جما'آنکھیں موندھ بھگوان سے لو لگائے رہتا لیکن ہمارے لئے تو یہ الہ دین کی غار تھی-[۹۵] اخلاقی حکایات بھی ناول کی کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں ایسی ہی ایک حکایت ناول میں سے یہاں بیان کی جا رہی ہے-

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک فقیر نے معرفت سے جانا کہ فلاں صحرا میں ایک حبشی بھوکا پیاسا بیٹھا ہے اور کئی دن سے فاقہ میں ہے تو اس فقیر کے لیے کچھ کھانے کے لیے جمع کیا اور اس صحرا قصد کیا چلتا چلتا۔۔۔۔ چلتا چلتا ایک ایسی جگہ پہنچا راحیلہ کہ سارے صحرا میں ٹیلے ہیں ٹیلے پھیلے تھے اور ایک جھاڑی کے قریب وہ حبشی بیٹھا ذکر میں مشغول تھا۔۔۔۔ فقیر پاس پہنچا اور تھیلے میں سے کھجوریں 'سرکہ 'شہد اور ستو نکال کر پیش کیے- حبشی مسکرایا اور ارد گرد ٹیلوں پر نظر کی.... فقیر نے بھی ارد گرد دیکھا تو سارے ٹیلے سونے کے بنے ہوئے تھے- حبشی نے آہستہ سے کہا'جب میری ایک نظر میں یہ کرامت ہے تو کیا میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتا؟ میں تو چاہتا ہوں کہ یہ کرامت زائل ہو اور اس کی رضا مل جائے۔۔[۹۶]

خود کلامی کی تکنیک بھی ناول کے بہت سے کرداروں میں نظر آتی ہے-ناول کے ایک ہندو کردار اوما کی خود کلامی کے ذریعے بانو قدسیہ نے اوما کے اپنے بھگوان کے بارے میں جو خیالات ہیں ان سے پردہ اٹھایا ہے-

میں راحیلہ سے حسد کرتی ہوں-اس کی محبت سے جو مستقبل میں اس کے لئے یقینی ہے-اس قدر قریب ہونے کے باوجود میں میں اسے یہ محبت ملتے خوش نہیں ہو سکتی..... یہ خیال بھی میرے لئے دکھ کا باعث ہے کہ بغیر ہاتھ ہلائے دکھ بھوگے راحیلہ محبت کے پالنے میں شاید کے ساتھ جھولے۔۔۔۔۔ہے بھگوان انسان کے اندر کی موہ مایا کیسی سوت کی اٹی ہے؟ کبھی سمجھ ہی نہیں

پاتی۔۔۔۔دیکھا ان دیکھا' جانا نہ جانا سب کچھ گھتم گتھا؟.....تو نے کیا سوچ کر یہ پر تھوی بنائی۔کیا سوچ کر اس میں انسان کو بسایا۔۔۔کیا سوچ کر اس کے من میں کلپنا کا یہ دریا بہایا۔ [97]

ناول میں مکالماتی تکنیک بھی نظر آتی ہے ناول میں سے اس کی مثال درج ذیل مکالمہ ہے۔

بابا جی۔۔۔۔

جی بیٹا۔۔۔۔

میرا خیال ہے۔۔۔اب تو میں کافی صحت مند ہوگئی ہوں۔۔۔اب مجھے یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔۔۔۔

کہاں جائیں بیٹا۔۔۔؟

کب تک ڈاکٹر کیسے کی نرم دلی کا فائدہ اٹھاتے چلے جائیں۔۔۔؟اگر وہ جانے کو نہیں کہتے تو.....اس کے یہ معنی تو نہیں کہ۔۔۔۔ہم ہمیشہ کے لیے یہاں پسر جائیں۔۔۔۔

تمہارا کوئی ٹھکانہ ہے۔۔۔؟

ہے تو سہی۔۔۔میں کالج واپس جا سکتی ہوں۔۔۔وہ اسے کسی نہ کسی کا پتہ چل جائے گا۔کسی سہیلی کا....کسی دوست کا....

ہاں میں تو صرف کیمپ واپس جا سکتا ہوں،میرے تو ماں باپ بھی زندہ نہیں کہ ان کے پاس لوٹ جاؤں۔۔۔بابا فضل بولا۔

آپ میرے ساتھ رہیں گے جہاں میں وہاں آپ۔۔۔یہ تو بستی ہیں نئے رشتوں کی ہے بابا جی۔۔۔میں تو آپ کو کبھی بھی نہ چھوڑوں۔۔ [98]

ناول میں بانو قدسیہ نے متذکرہ بالا تکنیکات کو استعمال کرنے کے علاوہ وہ جو نئے نئے تجربات کیے ہیں اس سے ناول کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔مصنفہ نے تمام تکنیکوں کو بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ اس طرح برتا ہے کہ وہ ناول کے پیشکش کے انداز کو مزید دلکش بنا رہی ہیں۔

ہر مصنف ناول کی زبان کو منفرد بنانے کے لیے ایک جداگانہ انداز اپناتا ہے بانو قدسیہ کا انداز بیان ایسا ہے جو ان کو باقی مصنفین سے انفرادیت بخشتا ہے۔زیر بحث ناول کی زبان میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار ملتا ہے۔مصنف اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت سے اثرات قبول کرتا ہے اس سے مصنف کی تحریر کو انفرادی پن ملتا ہے اور یہ انفرادی پن مصنف کے اسلوب میں دیکھا جا سکتا ہے۔بانو قدسیہ جس ماحول میں رہیں جن لوگوں سے اثرات قبول کیے اس کا اثر ان

کے اسلوب میں صاف طور پر دکھائی دیتا ہے-بانو قدسیہ کا ادبی و روحانی شخصیات کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے لب و لہجہ روحانی اور فلسفیانہ ہو گیا تھا اور نفسیات میں دلچسپی کی وجہ سے وہ کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ بھی کرتی تھیں-

مصنفہ کی زبان پر مشترکہ ہندوستانی تہذیب میں رہنے کی وجہ سے ہندی زبان کے بھی واضح اثرات ہیں-زیر بحث ناول میں ہندی الفاظ محاورات جملوں اور ہندی دیومالائی قصوں کی بہتات ہے-مصنفہ اردو زبان میں نے نئے نئے تجربات بھی کرتی رہتی تھیں اور خود سے وضع کردہ محاورات اور تشبیہات بھی زبان میں جدت پیدا کرنے کے لیے تخلیق کرتی تھیں -ناول میں جگہ جگہ تلمیحات کا استعمال نظر آتا ہے مصنفہ کرداروں کی تلمیحات کے ذریعے وضاحت کرتی ہیں-شہر لازوال آبادویرانے ایک سادہ نثر نہیں ہے بلکہ اس میں شعری التزام پایا جاتا ہے- شاعری نے ناول کی زبان کو مزید پرکشش بنا دیا ہے-

ناول میں اردو اور فارسی شاعری کے علاوہ مختلف زبانوں کے گیت بھی شامل ہیں- گیت ہندوستانی تہذیب کے عکاس ہیں ہندوستانی تہذیب میں غم خوشی کے موقع پر ہر قسم کے جذبات کا اظہار گیتوں کے ذریعے کیا جاتا ہے- مصنفہ کرداروں کے قلبی جذبات کی ترجمانی گیتوں کے ذریعے سے کرتی ہیں نیز گیت ہندی کلچر کا ایک اہم حصہ ہیں ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے گیت گاتے ہیں-ناول میں فارسی شاعری اور فارسی جملوں کو بھی بڑی روانی سے برتا گیا ہے —

ناول میں ہندی فارسی اردو انگریزی زبانوں کے استعمال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بانو قدسیہ مختلف زبانوں پر دسترس رکھنے کی بنا پر جہاں چاہتی ہیں کسی بھی زبان کو استعمال میں لے آتی ہیں- ناول کی زبان میں لوک داستانوں تمثیلی قصوں اور قدیم زمانے کے واقعات کی بھی بہتات ہے-

زیر بحث ناول میں ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی دل فریبی اور ماہرانہ انداز میں کیا گیا ہے- ضرب الامثال ہماری قدیم روایات معاشرتی اقدار اور تہذیبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں- ضرب الامثال کسی قوم کی تہذیب و معاشرت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں ہمارا تہذیبی سرمایہ ضرب الامثال کے توسط سے ہم تک پہنچتا ہے-مصنفہ کا انداز بیان معلوماتی اور تفصیلی ہے یہ تفصیلی انداز

ناول کی زبان کو قدرے خشک بنا دیتا ہے بانو قدسیہ ناول میں جگہ جگہ وعظ و نصیحت کرتی بھی دکھائی دیتی ہیں - مصنفہ نے ناول کی زبان میں کمال کی منظر نگاری کی ہے اور ارد گرد کے ماحول سے منفرد تشبیہات بھی وضع کی ہیں-

بانو قدسیہ نے زیر نظر ناول شہر لازوال،آباد ویرانے میں صاف ستھری با محاورہ،ادبی زبان استعمال کی ہے ۔ناول کو پڑھتے ہوئے سلاست اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔مصنفہ کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے-ان کے وسیع مشاہدے کا ثبوت ناول میں موجود مختلف زبانوں کے الفاظ کا استعمال، فلسفے کا استعمال، انسانی نفسیات کا مطالعہ ہے- معاشرے کے مطالعے سے انہوں نے تخیلاتی تخلیق کے بجائے ایک ایسی تخلیق پیش کی ہے جس میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات بھی شامل ہیں نیز یہ ناول ان کے عہد کی سماجی و معاشرتی زندگی کی مختلف تہذیبوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگیوں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ناول کی زبان اس کی کامیابی کے لیے بہت اہم تصور کی جاتی ہے۔ ناول کی زبان دلچسپ ہو گی تبھی قاری کے ذہن پر دیر پا اثرات چھوڑے گی۔خوبصورت اور دلکش جملوں کے استعمال سے مصنفہ نے اس ناول کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔مصنفہ کی تخلیق کو پڑھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے مختلف زبانوں کا فہم و ادراک ہونا لازمی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شہر لازوال آباد ویرانے کی زبان میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار ملتا ہے-

حوالہ جات

۱۔ سید عابد علی عابد، اسلوب (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء)، ص ۴۱۔

۲۔ ن۔م۔ راشد، مقالات، مرتب: شیما مجید، ص ۲۲۴۔

۳۔ سلطانہ بخش، پاکستانی اہل قلم خواتین (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۹۴۔

۴۔ فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۵ء)، ص ۲۹۔

۵۔ ماہنامہ چہارسو ، مارچ ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۔

۶۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص ۴۳، ۴۴۔

۷۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب (دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۶۵۔

۸۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص ۵۶۵۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۴۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۱۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۸۰۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۶۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔

۲۱۔ انور سدید،بانو قدسیہ: شخصیت اور فن،ص۱۰۲۔

۲۲۔ بانوقدسیہ:شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۱۰۲۔

۲۳۔ ایضاً،ص۱۰۲۔

۲۴۔ ایضاً،ص۴۳۳۔

۲۵۔ ایضاً،ص۴۲۱۔

۲۶۔ ایضاً،ص۴۰۸۔

۲۷۔ ایضاً،ص۱۵۹۔

۲۸۔ ایضاً،ص۲۲۸۔

۲۹۔ ایضاً،ص۹۔

۳۰۔ ایضاً،ص۱۵۔

۳۱۔ ایضاً،ص۲۲۔

۳۲۔ ایضاً،ص۳۴۳۔

۳۳۔ ایضاً،ص۳۶۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۸۔

۳۵۔ ایضاً،ص۳۱۷۔

۳۶۔ ایضاً،ص۳۷۳۔

۳۷۔ ایضاً،ص۵۲۶۔

۳۸۔ ایضاً،ص۵۱۱۔

۳۹۔ ایضاً،ص۳۱۲۔

۴۰۔ ایضاً،ص۵۳۲۔

۴۱۔ شہاب ظفر اعظمی،اردو ناول کے اسالیب،ص۱۶۶۔

۴۲۔ بانوقدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۴۷۴۔

۴۳۔ ایضاً،ص۵۷۰۔

۴۴۔ ایضاً،ص۴۷۲۔

۴۵۔ ایضاً، ص۴۴۹۔

۴۶۔ خالد یزدانی، چہرہ نما (لاہور: سید پبلشرز، ۲۰۰۶ء)، ص۵۷۔

۴۷۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷)، ص۱۸۳۔

۴۸۔ ایضاً، ص۱۷۶۔

۴۹۔ ایضاً، ص۳۱۳۔

۵۰۔ ایضاً، ص۳۱۳۔

۵۱۔ ایضاً، ص۳۴۔

۵۲۔ ایضاً، ص۱۲۷۔

۵۳۔ ایضاً، ص۴۲۸۔

۵۴۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب، ص۱۶۹۔

۵۵۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۱۸۵۔

۵۶۔ ایضاً، ص۸۰۔

۵۷۔ ایضاً، ص۴۰۰۔

۵۸۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب، ص۱۶۷۔

۵۹۔ فیاض محمود، تاریخ ادبیات، مسلمانان پاک و ہند، ص۵۲۴۔

۶۰۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۵۵۔

۶۱۔ انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۰ء، ص۴۷۹

۶۲۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۲۵۹۔

۶۳۔ عزیزہ سعید، حاصل گھاٹ اور کھیل تماشہ کا جائزہ (لاہور: جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء)، ص۱۰۸۔

۶۴۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۴۴۴۔

۶۵۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب، ص۱۶۸

۶۶۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص۳۷۱۔

۶۷۔ شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب، ص۱۶۸۔

۶۸۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۳۶۷

۶۹۔ ایضاً،ص۷۵۔

۷۰۔ ایضاً،ص۳۰۔

۷۱۔ انور سدید،بانو قدسیہ: شخصیت اور فن ،ص۱۴۱۔

۷۲۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۳۷۲۔

۷۳۔ ایضاً،ص۳۳۶۔

۷۴۔ انور سدید،بانو قدسیہ: شخصیت اور فن،ص۳۸۔

۷۵۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے ،ص۳۴۹۔

۷۶۔ ایضاً،ص۲۸۔

۷۷۔ ایضاً،ص۱۹۔

۷۸۔ شہاب ظفر اعظمی،اردو ناول کے اسالیب،ص۱۶۴۔

۷۹۔ بانو قدسیہ،شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۳۵۔

۸۰۔ ایضاً،ص۳۲۸۔

۸۱۔ ایضاً،ص۵۳۶۔

۸۲۔ انور سدید،بانو قدسیہ: شخصیت اور فن،ص۵۷۔

۸۳۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال،آباد ویرانے،ص۱۹۔

۸۴۔ ایضاً،ص۱۶۔

۸۵۔ ایضاً،ص۳۰۲۔

۸۶۔ ایضاً،ص۲۵۸۔

۸۷۔ ایضاً،ص۳۷۳۔

۸۸۔ شفیق الرحمن،اردو ناول میں تکنیک کے تجربات،(ملتان: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۳ء)، ص۶۲۔

۸۹۔ رضیہ فصیح احمد،ناول کی مبادیات، تکنیک اور اسالیب، مشمولہ،ماہنامہ کتاب،اسلام آباد۱۹۸۶ء،ص۷۔

۹۰۔ عبادت بریلوی،ناولٹ کی تکنیک، مشمولہ،نقوش، کراچی، شمارہ۱۹ ۲۰،اپریل ۱۹۵۲ء۔

۹۱۔ اقلیمہ ناز، بانو قدسیہ: احوال و آثار (مقالہ برائے ہی ایچ ڈی نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۵۱۔

۹۲۔ سفینہ بیگم، "مابعد جدید اردو ناول اور "شہر لازوال، آباد ویرانے" مشمولہ تسطیر کتاب ۶ دسمبر ۲۰۱۸ء۔

۹۳۔ انوار احمد، کہانی ماں بانو قدسیہ کا ناول، مشمولہ، وعدہ خلاف (کالم)، دنیا (روزنامہ) راولپنڈی ۲۳ جنوری ۲۰۱۳ء۔

۹۴۔ بانو قدسیہ، شہر لازوال، آباد ویرانے، ص ۵۴۹۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۹۶۔ ایضاً، ص ۹۹۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۲۹۹۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۴۴۳۔

ماحصل

ماحصل

معاصر عہد میں ناول کے فن کو بہت اہمیت حاصل ہے ہر دور کے ناولوں میں تہذیب و ثقافت کا عنصر نہایت اہم عنصر رہا ہے متعدد ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تہذیب و ثقافت کے موضوع کو برتا ہے معاصر عہد ہی کی ایک ناول نگار خاتون بانو قدسیہ (۱۹۲۸-۲۰۱۷ء) کے ناول تہذیبی تصورات کے حوالے سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں- مصنفہ نے تہذیب و ثقافت کے اہم موضوع کو اپنے ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں برتا ہے- بانو قدسیہ نے اس ناول میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کی بہترین عکاسی کی ہے-

یہ ناول قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے تہذیبی و ثقافتی حالات کے تناظر میں لکھا گیا ہے- بانو قدسیہ نے اس ناول میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کا شکار ہو جانے والوں کے ذہنی کرب اور کیفیت کو بھی عمدہ انداز میں بیان کیا ہے- ہجرت کوئی ایسا انہونا واقعہ نہیں تھا جو دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ پیش آیا تھا دنیا میں بہت سے لوگ نقل مکانی کرتے رہتے ہیں لیکن اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کی جبلی منتقلی نے لوگوں کے حواس کو بری طرح متاثر کیا وہ صرف اپنے گھروں اور زمینوں کو چھوڑ کر ہی نہیں جا رہے تھے بلکہ اپنی اقدار و روایات اور تہذیب کو بھی خیر باد کہہ رہے تھے یہی احساس ناول کی کہانی میں ہجرت کرنے والوں کے ہاں نظر آتا ہے-

برصغیر کی تقسیم کے واقعے کو ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ادیبوں نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا وہ افراد جو براہ راست اس واقعے سے متاثر ہوئے ان میں ایک نام بانو قدسیہ کا بھی ہے بانو قدسیہ نے ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کی ایک حساس انسان ہونے کے ناطے ان کے ذہن پر اس ہجرت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے یہ اثرات اس قدر گہرے تھے کہ ان کی آخری عمر میں بھی ان کے ذہن سے محو نہ ہو سکے-

مصنفہ نے اپنے آخری ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کا بیشتر حصہ تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا آپ اس واقعے کی عینی شاہد بھی تھیں یہی وجہ ہے کہ ناول کی کہانی میں اکثر جگہیں واقعات حقیقت پر مبنی ہیں مصنفہ نے تقسیم ہند کے دوران پائی جانے والی افراتفری، غم و غصہ، فسادات اور لوٹ مار کو اس ناول میں بڑی جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے تاہم ناول کا غالب عنصر ہندو مسلم تہذیب و ثقافت ہی ہے-

بانو قدسیہ کا شمار اردو ادب کی نامور ادبی شخصیات میں ہوتا ہے آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے مصنفہ نے اردو ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی آخر کار ۴ فروری ۲۰۱۷ء کو رحلت فرمائی- مصنفہ کا بچپن ایک مشترکہ

ہندوستانی معاشرے میں گزرا-ناول کی کہانی میں برصغیر کے علاقے دھرم سالہ میں بیان کئے گئے واقعات اس قدر جزئیات نگاری سے بیان ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ بانو قدسیہ خود اس علاقے کے پہاڑوں روایات رسم و رواج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھیں۔

بانو قدسیہ کی سوانح پڑھ کر اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ بانو قدسیہ نے اس علاقے کی تہذیب و ثقافت کا خود اپنی آنکھوں سے مطالعہ کر رکھا تھا-بانو قدسیہ تعلیم کے حصول کے لئے لاہور کالج اور ہاسٹل میں بھی رہیں اس ناول میں لاہور کالج اور ہاسٹل کا نقشہ بھی مصنفہ بڑی باریک بینی کے ساتھ کھینچتی ہیں-ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کا اپنی آنکھوں سے مطالعہ کرنے کے بعد اس ناول میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کو پیش کرنے والی اس ادیبہ کے ہاں تخیل سے زیادہ حقیقت فرمائی ملتی ہے-

اس مقالے میں بانو قدسیہ کے تازہ ترین اور آخری ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کا جائزہ لیا جائے گا-یہ ناول بانو قدسیہ کی وفات کے بعد بعد ۲۰۱۷ء میں لاہور سے شائع ہوا-اس موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد درج ذیل سوالات پر رکھی گئی ہے:

۱- ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں کرداروں کے رویوں میں تہذیب و ثقافت کا اظہار کس طرح ہوا ہے؟

۲- ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کی کہانی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کی شکست و ریخت کی کون کون سی صورتیں نظر آتی ہیں؟

۳- ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں سماج اور ثقافت پر تقسیم کے مابعد اثرات کیا مرتب ہوئے؟

۴- ناول شہر لازوال، آباد ویرانے میں پیش کردہ ہندو مسلم تہذیب میں ثقافتی امتزاج اور انحراف کی کون کون سی صورتیں نظر آتی ہیں؟

۵- ناول شہر لازوال، آباد ویرانے کی زبان کے ذریعے تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار کس طرح کیا گیا ہے؟

مقالے کو تحریر کرتے وقت حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام سوالات کے جوابات مقالے میں تحریر کئے جائیں-ہندو مسلم تہذیب و ثقافت کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری تھا کہ تہذیب و ثقافت کے بارے میں علم حاصل کیا جائے-اسی ضرورت کے پیش نظر مقالے کے پہلے باب میں تہذیب و ثقافت کا مختصر تعارف اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں-

مختلف لغات میں تہذیب و ثقافت کے معنی دیکھ کر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ تہذیب کا تعلق خارجی چیزوں سے جبکہ ثقافت کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو ہمارے ذہن سے جڑی ہوتی ہیں تاہم دنیا کی تمام لغات بھی کلچر کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف پیش کرنے سے قاصر ہیں جس میں کلچر کی واضح تصویر موجود ہو۔ جمیل جالبی نے تہذیب و ثقافت دونوں الفاظ کو یکجا کر کے اس کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ فیض احمد فیض بھی تہذیب کو کلچر ہی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر سلیم اختر تہذیب و ثقافت کے فرق کو دریا اور اس کی لہروں سے سے تشبیہ دے کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں سجاد باقر رضوی تہذیب کو اصل جبکہ ثقافت کو تہذیب کا بہروپ سمجھتے ہیں۔ ڈی۔ ایس سیوج بیج کے مغز اور اس کے چھلکے میں جو فرق ہے وہی فرق کلچر اور تہذیب کے مابین قرار دیتے ہیں۔ ماہرین سماجیات تہذیب اور ثقافت کو ایک ہی سکے کے دو رخ قرار دیتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی الگ الگ ہیں۔

اردو میں تہذیب کا لفظ جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس میں اصلاح، آراستگی، شائستگی، تمیز، طرز معاشرت، درستگی کے علاوہ اخلاقی اور روحانی رویے، مصوری، خطاطی، شاعری اور تمام علوم و فنون بھی کلچر ہی کے زمرے میں آتے ہیں۔ ماہرین تہذیب کے دو مظاہر مادی اور غیر مادی مظاہر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مادی مظاہر میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جنہیں انسان اپنے حواس کی مدد سے دیکھ سکتا ہے مثلاً آلات و اوزار، موسیقی کے آلات، آمد و رفت کے ذرائع، عمارات، ملبوسات، برتن وغیرہ اور غیر مادی مظاہر میں رسوم و رواج، آداب، اخلاق و اقدار شامل ہیں علاوہ ازیں خوشی غمی کی رسومات، کھیل، تہوار بھی تہذیبی عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔

کلچر ایک مختلف المعنی اصطلاح ہے اس کی ہر دور ہر ملک ہر زبان اور ہر شعبے میں الگ الگ تعریفیں بیان کی جاتی رہی ہیں حیاتیات، بشریات، نفسیات، تاریخ اور سوشیالوجی میں کلچر پر طویل بحثیں کی گئی ہیں ایک ماہر بشریات مالنوسکی کے کلچر کے سائنٹیفک نظریے کا ترجمہ و مفہوم ہے کلچر میں اوزار، ہتھیار، دستور نامے، صناعات، عقائد، رسم و رواج، انسانی افکار اور صارفین کی کل اشیاء شامل ہیں۔

مغربی ماہرین نے بھی تہذیب کے متعلق اپنی مختلف آراء پیش کی ہیں ریمنڈ ولیمز کلچر کو انگریزی زبان کے چند پیچیدہ ترین الفاظ میں شمار کرتا ہے الفریڈ کروبر کلچر اور سولزیشن کو ایک ہی چیز کے مختلف درجے قرار دیتا ہے ٹائلر بھی کلچر اور سولائزیشن کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی چیز شمار کرتا ہے ٹائلر سے قبل کلچر کو اصطلاح شمار نہیں کیا جاتا تھا پہلی بار ٹائلر نے ہی اس کو ایک اصطلاح کا درجہ دیا۔ ٹائلر کلچر میں علوم و فنون، عقائد، رسم و رواج، قوانین اور ان تمام چیزوں کو شامل کرتا ہے جو ایک انسان معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے اپناتا ہے۔ ٹائیلر کی بیان کردہ تعریف آج بھی

معمولی تبدیلی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے-آج کل کلچر کے مظاہر کو بھی کلچر ہی سمجھ لینے کا رجحان عام ہو چکا ہے مثال کے طور پر آرٹ کو کلچر سمجھا جاتا ہے جبکہ آرٹ کلچر کا محض ایک جز ہے ایلیٹ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ لوگ آرٹ، معاشرتی نظام، رسوم ورواج کو کلچر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ چیزیں کلچر نہیں بلکہ وہ کچھ ہیں جن سے کلچر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے-

رسم ورواج، روایات، قوانین کو اگر انفرادی طور پر اپنایا جائے تو ان کا شمار کلچر میں نہیں ہوتا انہیں اقدار وروایات کو بغیر کسی جبر کے معاشرے کے تمام افراد اجتماعی طور پر باقاعدگی سے اپنائیں تبھی اس کا شمار کلچر کے ذیل میں آئے گا-اردو تصنیفات میں تہذیب کی اصطلاح کا اولین بار ذکر تذکرہ گلشن ہند (۱۸۰۱ء) میں ملتا ہے-سرسید احمد خان وہ پہلے دانشور تھے جنہوں نے تہذیب کا جدید مفہوم پیش کیا سرسید نے کلچر کا مفہوم مغرب سے مستعار لیا تھا یہی وجہ ہے کہ سرسید بھی کلچر اور سولزیشن کو ایک ہی تصور قرار دیتے ہیں-

سرسید احمد خان سولزیشن اور کلچر کی الگ الگ تعریف بیان کرنے کے بجائے تمام مادی اور غیر مادی پہلوؤں کو اکٹھا بیان کرتے ہیں سرسید کے بیان کردہ تہذیب کے جدید مفہوم سے تہذیب کی یہ تشریح ہوتی ہے کہ کسی گروہ یا معاشرے کی وہ اجتماعی عادتیں جو ان کی زندگیوں کا حصہ بن گئیں ان عادتوں کے ساتھ ساتھ اس گروہ کے خیالات اور عقائد بھی تہذیب کا حصہ ہیں-

مختلف محققین ناقدین اور دانشوروں کی تہذیب کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں-ڈاکٹر جمیل جالبی زبان، فکر، عادات واطوار، مذہب، طرز معاشرت، عقائد، رسم ورواج، معاشرتی ادارے اور ان تمام چیزوں کے مجموعے کو کلچر کا نام دیتے ہیں- جمیل جالبی کلچر کے زمرے میں اور بھی بہت سی چیزوں جس میں زندگی کے مختلف مشاغل، اپنی روایات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا، غلط چیزوں کی اصلاح، معاشرت میں حسن، بول چال میں نرمی کو بھی شامل کرتے ہیں-کسی جبری قانونی منصوبہ بندی کے بغیر خوش دلانہ طور پر افراد کے اندر ایسی چیزیں جن میں کوئی جبر نہیں ہوتا بلکہ حسن اور سلیقہ ہوتا ہے سید عبداللہ ان کو کلچر کے ذیل میں شمار کرتے ہیں-

سبط حسن زبان، رہن سہن، عقائد وافسوں، روایات، عشق ومحبت کے سلوک، خاندانی تعلقات، فلسفہ و حکمت، فنون لطیفہ اور اخلاق وعادات کو تہذیب کے مختلف مظاہر قرار دیتے ہیں-سبط حسن تہذیب کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان اور تہذیب آپس میں لازم وملزوم ہیں ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر وجود ممکن نہیں انسان کے اندر بعض ایسی خصوصیات موجود ہیں جو انسان کے علاوہ دنیا کی کسی دوسری مخلوق میں موجود نہیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر انسان تہذیب پر قدرت رکھتا ہے-

سبط حسن کا کہنا ہے کہ تہذیب چار عناصر ترکیبی طبعی حالات، آلات واوزار، نظام فکر واحساس اور سماجی اقدار سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ کلچر کے بارے میں فیض احمد فیض اپنا نقطہ نظر یہ پیش کرتے ہیں کہ امیر غریب ہر انسان کو تفریح کی ضرورت پڑتی ہے کبڈی کھیل کر یا پھر تھیڑ جا کر ہر انسان کسی نہ کسی طریقے سے اپنے لئے تفریح کا سامان جمع کرتا ہے اگر کوئی شخص غریب ہے تب بھی وہ کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر لیتا ہے کیونکہ جس طرح انسان کو جسمانی ضرورت پوری کرنے کے لئے روٹی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روح کی تسکین کے لیے تفریح کی ضرورت پڑتی ہے تفریح بھی روٹی کپڑا مکان کی طرح ضروریات زندگی میں شامل ہے۔

طبقاتی کلچر کے بارے میں فیض احمد فیض کہتے ہیں کہ ہر قوم کے اندر امراء، شرفاء، غرباء غرض تمام طبقات کا اپنا اپنا مخصوص کلچر ہوتا ہے تمام طبقات کا کلچر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ہر طبقے کے کلچر میں کچھ ایسے مشترک عناصر بھی پائے جاتے ہیں جو اجتماعی ہوتے ہیں وہ مشترکہ عناصر اس ملک کے مجموعی کلچر کے زمرے میں آتے ہیں۔

مختلف ناقدین اور دانشوروں کی بیان کردہ تعریفوں کے نتیجے میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلچر خالصتاً ایک معاشرتی عمل ہے انسان کے بغیر کلچر وجود میں نہیں آسکتا ایک معاشرے کے اندر رہتے ہوئے انسان ایسا طرز زندگی اختیار کرے جس میں باضابطگی پائی جائے یہی کلچر ہے یہ مادی بھی ہو سکتا ہے اور غیر مادی بھی۔ کلچر ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل بھی ہوتا ہے اور ایک معاشرے میں رہتے ہوئے بھی انسان اس کا اکتساب بھی کیا کرتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کلچر کا تعلق وراثت سے ہوتا ہے کیونکہ ایک بچہ اپنے والدین کے کلچر کے بجائے ماحول سے بھی کلچر کا اکتساب کرتا ہے۔

کلچر دراصل زندگی گزارنے کا وہ شائستہ طریقہ ہے جس کے اندر مادی اور غیر مادی عناصر بغیر کسی جبر کے باضابطگی کے ساتھ پائے جائیں کسی معاشرے کے افراد میں کوئی بھی عمل اگر انفرادی ہو چاہے وہ کتنی ہی باقاعدگی کے ساتھ انجام دیا جائے وہ کلچر کے ذیل میں نہیں آئے گا کلچر دراصل وہ نظام حیات ہے جو ایک معاشرے کے لوگوں میں مشترکہ طور پر کسی قانونی جبر کے بغیر پایا جائے معاشرے کے افراد کو کسی قانونی جبر کے تحت ان رسم ورواج اور عقائد و روایات کو اپنانے پر مجبور نہ کیا جائے بہر حال انہیں عقائد رسم ورواج قوانین اقدار اور روایات سے ہی کلچر کی تشکیل ہوتی ہے۔

ناول کے کرداروں میں مختلف تہذیبی اور ثقافتی رویوں کا اظہار ملتا ہے ان تہذیبی و ثقافتی رویوں میں لباس، رسومات، رہن سہن، ملنے جلنے کے آداب طور طریقے شامل ہیں ہر قوم اور طبقے کے لوگوں کے تہذیبی و ثقافتی رویے

دوسری قوموں سے مختلف ہوتے ہیں -مصنفہ نے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار چوکیدار، مالی، نائی، نوکرانی مالکن، پولیس سپاہی، جنرل کرنل، پروفیسر، ڈاکٹر، ایڈوکیٹ، نوابین، سیاستدان، بیوروکریٹ اور جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو تخلیق کیا علاوہ ازیں ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے کردار ہندو مذہب، عیسائی مذہب، بدھ مذہب، سکھ مذہب اور مسلم کرداروں کو بھی ناول کی کہانی کا حصہ بنایا یہ تمام کردار اپنی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں-

مصنفہ نے تمام کرداروں کو اپنے کلچر کی بہترین ترجمانی کرتے ہوئے دکھایا ہے برصغیر پاک وہند کی مشترکہ تہذیب سے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی مذہب کے کرداروں کے علاوہ اینگلوانڈین کردار اور انگریز کردار بھی اپنے کلچر کی بڑی کامیابی کے ساتھ تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں- شہروں میں رہنے والے کردار شعری معاشرت کے نمائندہ پر آسائش زندگی بسر کرنے والے، زمانہ جدید کی تمام سہولیات سے آراستہ زندگی بسر کرتے جبکہ دیہات کے کرداروں کے ذریعے سے بانو قدسیہ نے مشرقی کلچر کے نمائندہ اپنی تہذیب واقدار اپنی مٹی سے پیار کرنے والے، گاؤں کے کھیتوں میں کام کرنے والے، لحاظ، مروت، مہمان نوازی، ادب واحترام جیسی روایات کا پاس رکھنے والے کردار تخلیق کیے ہیں-

یہ تمام کردار اپنے مذہب اور کلچر سے قاری کو روشناس کراتے ہیں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے کرداروں کے ذریعے سے نہ صرف برصغیر کی تہذیب و ثقافت سے بھرپور واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ تاریخی واقعات کا بیان بھی ملتا ہے ناول کا ہر کردار اپنے مذہب کے کسی مذہبی یا تاریخی کردار سے جڑا نظر آتا ہے- برصغیر پاک وہند کے علاقوں کی تاریخ معاشرتی حالات اس دور کے لوگوں کے نظریات اور اعتقادات کرداروں کے رویوں میں نظر آتے ہیں- جاگیر دار اور بیوروکریٹ طبقہ اپنی زبان رہن سہن سے اپنے کلچر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے نچلے طبقے کے کردار بھی اپنے تہذیبی و ثقافتی رویوں کے ساتھ نظر آتے ہیں تہذیبی اقدار کبھی بھی کسی ایک طبقے میں پروان نہیں چڑھتیں بلکہ ہر طبقہ چاہے وہ اعلیٰ متوسط یا نچلا طبقہ ہی کیوں نہ ہو اس کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے-

اگر کوئی مسلم کردار ہے تو اس کے ہاں مسلم تہذیب و ثقافت کا اظہار مسلمانوں کے مذہبی تہوار، لباس، سلام کرنے کے انداز، زندگی گزارنے کے طریقے، عبادات اور روایات سے ہوتا ہے- مسلم تہذیب کے نمائندہ کردار اپنے لباس نشست و برخاست روایات واقدار عبادات میں مکمل طور پر اپنی مسلم تہذیب کو اپنائے ہوئے ہیں مردانہ کردار ہمیشہ سفید شلوار قمیض زیب تن کرتے سنت کے مطابق داڑھی، سر پر پگڑی، ہاتھوں میں تسبیح یہ کردار اپنے حلیے سے بھی اور طور اطوار سے بھی اپنی مسلم تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں-لباس محض تن پوشی کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ

کسی قوم کی ثقافت اور تشخص کی علامت بھی ہوتا ہے کسی بھی شخص کا لباس دیکھتے ہی اس کے مذہب اور کلچر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ناول کے مسلم کردار اپنے لباس سے اسلامی تہذیب کے ترجمان نظر آتے ہیں مسلم کردار اپنے مذہب اور تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اپنی زندگی کے ہر عمل میں اسلام کے اصولوں کو ترجیح دیتے ہیں موت اور آخرت کے بارے میں عقائد، مذہبی اصولوں کی پاسداری، صفائی کو عزیز رکھنا، نمازوں کی پابندی کرنا، نامحرم سے میل جول کے بارے میں احتیاط، روحانی علاج، مسجد سے پانی دم کروانا، اعتقاد مسلم کرداروں کے ہاں نظر آتا ہے علاوہ ازیں مسلم کرداروں کے ہاں اسلام کے اہم رکن نماز روزہ زکوۃ کا ذکر بھی ملتا ہے سحری افطاری کے علاوہ مسلم تہذیب میں پائی جانے والے اس روایت کا بھی ذکر ملتا ہے جس میں آدھی رات کو لوگ سحری کے لئے جگانے آتے ہیں۔

نسوانی کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق پردے کا اہتمام کرتیں برقع پہنتیں نمازوں کی پابندی کرتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مسلم تہذیب کو بیان کرتے وقت بانو قدسیہ مسلمانوں کے تمام مذہبی تہوار عید شب برات محرم پورے جوش و خروش اور عقیدت کے ساتھ مناتے، عہد کریمہ کا ختم کرواتے اور بچوں کی اسلامی تہذیب کے مطابق تربیت کرتے ہوئے دکھاتی ہیں۔

ہندو مذہب کے نمائندہ کرداروں کے نام لباس زبان عقائد نظریات طور اطوار رہن سہن ملنے جلنے کے آداب سے ہندی تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے ہندوؤں کے ہاں کزن آپس میں بہن بھائی ہوتے ہیں اور کسی صورت ان کی شادی ممکن نہیں ہوتی ہندو گوشت نہیں کھاتے اپنے مذہبی امور پر سختی سے کاربند رہتے ہیں ان کے ہاں گائے کو ماں کا درجہ دیا جاتا ہے اور گائے کا گوشت کھانا کبیرہ گناہ سمجھا جاتا ہے گائے کی پوجا کرنا اور اس کے گوبر اور پیشاب کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

گانا بجانا ان کے مذہب کا حصہ ہے اپنے بھگوانوں کو خوش کرنے کے لئے گانا بجانا سیکھتے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں جنم جنم کا عقیدہ بھی ملتا ہے اور ہندوؤں کی شادی کی رسم میں پھیرے لگائے جاتے ہیں تاکہ جنم جنم کا ساتھ باقی رہے ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انسان کا بار بار جنم ہوتا ہے اور ہر جنم میں انسان نئے روپ میں پیدا ہوتا ہے۔

ہندی تہذیب میں لوک کہانیوں کا بہت زیادہ رواج ہے ہر موقع پر راجوں مہاراجوں اور مذہبی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ کرداروں کے رویوں میں ہندوؤں کی موت کی رسومات کا ذکر بھی ملتا ہے ہندو شمشان بھومی میں مردے کو لے جاکر سنکھ بجاتے ہیں اس کے بعد ارتھی کو آگ لگاتے ہیں اور اونچا اونچا رام نام ست ہے کہتے ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار کڑواچوتھ، دیوالی، بسنت اور جنم اشٹمی کا ذکر بھی ناول کے ہندو کرداروں کے ہاں ملتا ہے۔

ہندو اپنے پورے گھر میں دھونی دیتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اس طریقے سے بری آفات اور جنوں بھوتوں کا ختم ہو جاتا ہے اور دیوتاؤں کی آرتی اتارتے، ان کی شان میں گیت گاتے، ہر منگل کے روز مندر جاتے، گھر میں بھی الماریوں میں دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی ہوتی ہیں۔ ہندی خواتین عام طور پر ساڑھیاں پہنتیں ہیں ہندو مذہب میں شادی شدہ خواتین اپنے ماتھے پر سیندور لگاتی ہیں جس سے وہ پہچانی جاتی کہ وہ شادی شدہ ہیں۔

سکھ کرداروں کے رویوں میں ان کی تہذیب و ثقافت کا اظہار ان کی معاشرت سے ہوتا ہے سکھ معاشرت میں ہر بات میں جی لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے سکھ خوشی اور غم کے موقع پر واہگرو کو یاد کرتے اپنی مذہبی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا ہوتے ہیں ان کے ہاں سیس کٹوانے کا رواج نہیں ہوتا—وہ کھدر کا لباس اور پنجابی جوتی پہنتے ہیں اپنی زبان پنجابی سے بہت محبت کرتے اور ہر حال میں وہ اپنی زبان بولتے ہیں۔

ناول کی کہانی میں سکھ کلچر کے نظریات ملتے ہیں جس میں یہ بیان ملتا ہے کہ ایک سکھ سوا لاکھ آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔ مرد سکھ کلچر میں جابر بن کر عورت پر حکومت نہیں کرتا۔ یہ قوم دلوں میں نفرت نہیں رکھتی صاف نیت والی قوم ہے منہ پر ہر بات کرتی ہے دلوں میں بغض نہیں رکھتے۔

ناول کے عیسائی کردار اپنے لباس عقائد و نظریات میں عیسائی مذہب کے ترجمان نظر آتے ہیں یہ اپنی ہر صبح کا آغاز یسوع مسیح سے دعا کے ساتھ کرتے ہیں ان کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ تمام انسان گناہگار پیدا ہوئے ہیں اور یسوع مسیح حضرت عیسی انسانوں کے گناہ دھونے کا ذریعہ ہیں۔ عیسائی حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ تعالی کا بیٹا مانتے ہیں یسوع مسیح سے لمبی لمبی دعائیں مانگتے اور اپنی مذہبی کتاب بائبل پڑھتے ہیں۔

بانو قدسیہ بدھ مذہب کے کلچر کو بھی اس مذہب کے نظریات کے ذریعے واضح کرتی ہیں۔ بدھ مذہب کے کلچر کے مطابق جب بچہ گیارہ برس کا ہو جاتا ہے تو اسے ضرورت کی چند اشیاء تھما کر لاما بننے کے لیے بدھ مذہب کی عبادت گاہ میں بھیج دیتے ہیں لاما دنیا کو ترک کر کے صرف اور صرف عبادت کرتا ہے بچوں کو پہلے کڑے امتحان سے گزارا جاتا ہے کہ وہ لاما بننے کے قابل ہیں بھی یا نہیں ناول کی کہانی میں میں کرداروں کے رویوں میں بدھ مذہب کے عقائد کا بیان ملتا ہے—

بدھ مذہب کی عبادت گاہوں میں عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی لاما کا بدھ مذہب میں بہت احترام کیا جاتا ہے لوگ لاما کے آگے زمین پر اپنا سر جھکا کر بہت عاجزی کے ساتھ بات کرتے ہیں مذہبی لوگ ان کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے ناول کے تمام کردار تہذیبی نقطہ نظر سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں ناول کے تمام کردار اپنے تہذیبی حوالے پیش کرتے ہیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شہر لازوال، آباد ویرانے تہذیبی تناظر

میں لکھا گیا ناول ہے اس ناول میں دو بڑی تہذیبوں ہندی تہذیب اور مسلم تہذیب کے کرداروں میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار ملتا ہے علاوہ ازیں سکھ مذہب مذہب بدھ مذہب عیسائی مذہب کے کردار بھی اپنے اپنے کلچر کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے زیر بحث ناول میں تہذیبی و ثقافتی رویوں میں شکست و ریخت کو مذہب سماج اور سیاست کے حوالے سے بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔مصنفہ ایک ایسے معاشرے میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو بیان کرتی ہیں جو قیام پاکستان کے بعد اپنے ہی ملک کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا ان گنت قربانیوں کے بعد حاصل کیے گئے پاکستانی معاشرے میں لوگ اپنی مذہبی اقدار کو کچل کر اخلاقیات کا جنازہ نکالنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔فیوڈل یا بیوروکریٹ ایک ایسا خود پسند طبقہ ہے جس میں دولت کی فراوانی ہے لوگ ناجائز کمائی سے بینک بیلنس بنا رہے ہیں غلط کاموں میں ایک دوسرے کا سہارا بنتے اور مل کر پیسے بناتے ہیں۔

اس معاشرے میں عورت صرف جسمانی ضرورت کی چیز سمجھی جاتی ہے محبت کے نام پر عورتوں کو بیوقوف بنایا جاتا استعمال کرنے کے بعد انہیں پھینک دیا جاتا ہے اور عورت مدد کے لئے جب کسی مرد کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو اس کو دولت کی خواہش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ناول میں بانو قدسیہ طوائف کو اقدار کی شکست و ریخت کی علامت بنا کر پیش کرتی ہیں۔

طوائفیں اپنی معاشرتی روایات کو پس پشت ڈال کر غیر مردوں سے تعلقات استوار کرتی ہیں اپنی ساری زندگی نوابین جاگیرداروں سیاستدانوں کی آسائش کا سامان مہیا کرنے میں گزار دیتی ہیں بانو قدسیہ ناول کی کہانی میں طوائف کی داخلی خود کلامی کے ذریعے اس کی ذات میں ہونے والی شکست و ریخت کو بیان کرتی ہیں طوائف ہزاروں لوگوں کی منظور نظر دولت کی کسوٹی میں تولی جاتی ہے اس کا اپنا کوئی خاندان نہیں ہوتا کوئی گھر نہیں ہوتا ڈھلتی عمر اور مستقبل کا خوف اس کی راتوں کی نیند لے اڑتا ہے مذہبی اور اخلاقی قدروں سے کٹ کر طوائفیں کبھی بھی حقیقی خوشی سے ہمکنار نہیں ہو پاتی اور ذہنی ابتری کا شکار ہو جاتی ہیں دولت کی ریل پیل انہیں کبھی قلبی اطمینان نہیں دے سکتی۔ طوائف جب مذہبی حدود کو پھلانگ کر ہر طرح کی معاشرتی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف دولت کی چاہ میں گناہ اور ثواب کی تفریق کیے بغیر گھناؤنا کاروبار کرتی ہے آخر کار تہی داماں رہ جاتی ہے۔

ناول کی کہانی میں ایسے کردار ہیں جو اپنے کلچر اور مذہب سے دور معاشرتی اور مذہبی اقدار اور روایات کی شکست و ریخت کا شکار ہیں حرام طریقے سے حاصل کی گئی کمائی سے ان کی نسلیں بھی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہیں۔

بانو قدسیہ ایک ایسے معاشرے کی برائیوں سے پردہ اٹھاتی ہیں جہاں ڈاکٹر چند پیسوں کی خاطر اسقاط حمل جیسے بڑے گناہ کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ پاکستانی معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کو بیان کرتے ہوئے ناول کی کہانی میں دکھاتی ہیں کہ معاشرتی نظام برے طریقے سے بگڑ چکا ہے رشوت دے کر ناجائز کام کو بھی جائز بنالیا جاتا ہے۔مصنفہ اخلاقی اقدار کی شکست وریخت کو ایک ایسی عورت کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کرتی ہیں جس کو اس کا سگا ماموں جنسی تشدد کا نشانہ بناتا ہے خونی رشتے ہی جب تقدس پامال کرنے پر تل جائیں تو ایسے معاشرے میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

ناول کی کہانی میں جسمانی اور ذہنی ہر سطح پر عورت کا استحصال نظر آتا ہے جنسی بے راہ روی معاشرے میں عام ہو چکی ہے اخلاقی پستی کے نمونے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں مذہبی اقدار کو فراموش کر بیٹھے ہیں معاشرہ جو اپنی مذہبی واخلاقی اقدار سے باغی ہو چکا ہے اپنی اقدار وروایات کو فراموش کر کے ایسے معاشرے تہذیبی اور اخلاقی بحران کا شکار ہو جاتے ہیں۔اخلاقی قدروں کے زوال نے انسان کو خونی رشتوں سے بے اعتبار کر دیا ہے اس ہوس پرست معاشرے میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا اگر خونی رشتے نفسانی ہوس کی بھینٹ چڑھادیں تو انسان اپنوں سے بھی اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔

بانو قدسیہ نے جاگیر دارانہ نظام میں پائی جانے والی برائیوں کو نشانہ بنایا ہے جاگیر دار طبقہ رشوت دے کر ملک کے سیاستدانوں اور پولیس کے اعلیٰ افسران کو خرید لیتا ہے اپنے علاقے کے مزارعوں پر حکومت کرتا ہے ملک میں اسلامی نظام رائج کرنے کی باتیں تو کرتا ہے لیکن خود ہر وہ کام کرتا ہے جس کی مذہب اسلام میں اجازت نہیں ہے شراب نوشی اور طوائفوں کے ساتھ تعلقات عام ہیں اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے والے زوال پذیر کردار جو بظاہر انسانیت کے اعلی درجے پر فائز ہیں خود کو دین دار ظاہر کرتے ہیں درحقیقت یہ جاگیر دار اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑاتے پھر رہے ہیں۔

جاگیر دار طبقے سے تعلق رکھنے والے وڈیرے عیاش طبیعت کے مالک ہیں اس طبقے میں نامحرم عورتوں کے ساتھ تعلقات معمول کی بات ہے اس لیے ان وڈیروں کی بیویاں شوہر کی گھر لائی ہوئی طوائفوں کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں جاگیر دارانہ نظام سے تعلق رکھنے والی عورتوں کا اپنے مزارعوں کے ساتھ رویہ روایتی وڈیروں جیسا ہے اپنی دولت کے گھمنڈ میں انسان کو انسان نہیں سمجھتی بات بات پر نوکروں کو گالیاں دینا ان کو ذلیل ورسوا کرنا کمین ہونے کے طعنے دینا بلاوجہ بے نقط باتیں سنادینا ان عورتوں کا وطیرہ ہے۔

مزارعے ظلم کی چکی میں برسوں سے پستے چلے آئے ہیں جاگیر دار طبقے کے نسل در نسل غلام ہوتے ہیں بری طرح عزت مجروح ہونے کے باوجود بے بسی کی تصویر بنے گالیاں کھاتے جاگیرداروں کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں ان کے آباؤاجداد کی زندگیاں اور آنے والی نسلوں کی زندگیاں اس طبقے کی غلامی میں گزر جاتی ہیں۔

بانو قدسیہ ناول کی کہانی میں نوابین کو اخلاقی اقدار کی شکست وریخت کی علامت بنا کر پیش کرتی ہیں ان کے ہاں دولت کی ریل پیل ہوتی ہے نوابین فطرتاً رنگین مزاج ہوتے ہیں بڑھاپے میں پہنچ کر بھی ان کے مزاج کی رنگینی ختم نہیں ہوتی قیمتی گاڑیوں میں گھومنا، روپے پیسے کو پانی کی طرح بہانا، طوائفوں کے ساتھ تعلقات ان کا وطیرہ ہوتا ہے طوائفیں بھی تحفے تحائف کے لالچ میں ان کی جھوٹی تعریفیں کرتیں آگے پیچھے پھرتیں اور ان کا دل بہلاتی ہیں۔ بیوروکریٹ طبقہ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر حرام کمائی سے بے تحاشا جاگیر بنا چکا ہے اپنے عہدے اور طاقت کے نشے میں چور رشوت لے کر ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کئی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھے یہ طبقہ معاشرے میں چہرے پر نقاب چڑھا کر اپنے کردار کی پستی کو چھپا کر ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکا ہے۔ بیوروکریٹ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد زنا جیسے عظیم گناہ کا مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے گناہوں کو چھپانے کے لئے بچوں کا قتل کروا دیتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے ناول کی کہانی میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کی شکست وریخت کو اینگلو انڈین کرداروں کی صورت میں دکھایا ہے یہ اینگلو انڈین کردار مغربی کلچر کے رنگ میں رنگے ہوئے اپنے کلچر سے بغاوت کرتے ہیں ایک پاکستانی اور مسلمان معاشرے میں رہتے ہوئے امرد پرستی اور مشت زنی کو ایک ناپسندیدہ فعل سمجھنے کے بجائے اپنے مذہب کے برخلاف ان باتوں کی حمایت کرتے ہیں یہ کردار اپنے رسم و رواج کے خلاف بغاوت کرتے اور آزادانہ جنسی تعلقات کو درست سمجھتے ہیں یورپ سے متاثر یہ کردار اس حد تک آزاد خیال ہیں کہ ان کا ماننا ہے کہ عورت شادی کے بغیر بھی بچے پیدا کر سکتی ہے بچے پیدا کرنے کے لئے شادی کی قطعاً ضرورت نہیں عورت اس معاملے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔ یہ کردار سڑکوں پر ٹائر جلا کر حکومتی املاک کو نقصان پہنچا کر سمجھتے ہیں کہ وہ عوام کی بہتری کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مصنفہ نے اعلیٰ سوسائٹی کے چونچلے ان کی منافقتیں اور ریاکاری کو ناول کی کہانی میں کھلے عام بیان کیا ہے۔

ناول کی کہانی میں ایسے کردار دکھائے گئے ہیں جن کے سر پر پیسے کی دھن اس قدر سوار ہے کہ وہ دولت کے حصول کے لیے ہر ناجائز طریقہ اختیار کرنے سے نہیں چوکتے قتل، بیوہ کے ساتھ جنسی تعلقات یتیم کا مال ہڑپ کرنا جیسے عظیم گناہ کا مرتکب کرتے ہیں یہ تمام اعمال وافعال ہمارے مذہب میں ناپسندیدہ ہیں مگر مادیت کی دوڑ میں بھاگتے ہوئے انسان ان عظیم گناہوں کا مرتکب ہونے کے بعد داخلی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مصنفہ سماج کے ان منفی

رویوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن سے اخلاقی اقدار کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ بے حسی فرد کی بے ضمیری اور خود غرضی سے معاشرہ کھوکھلے پن کا شکار ہو رہا ہے حصول زر وزن کی خواہش میں انسان تمام اخلاقی و مذہبی حدود کو پار کر کے داخلی و خارجی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔

بانو قدسیہ کسی مخصوص طبقے کو زیر بحث نہیں لاتی بلکہ وہ اس ناول میں مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے زوال آمادہ معاشرے جس میں پولیس سیاستدان حکومتی افسران سے لے کر عام آدمی تک سبھی کے ہاں شکست وریخت کی مختلف صورتیں بیان کرتی ہیں اپنی اپنی جگہ ہر شخص ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہا ہے چھوٹی بڑی ہر سطح اور ہر شعبے میں دھاندلی ہو رہی ہے اقتدار دولت شہرت حاصل کرنے کی چاہ میں نام نہاد اجارہ دار طبقہ غلط کاموں میں ملوث نظر آتا ہے یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں ناانصافیاں اپنے پورے زوروں پر ہیں قانون عوام کا رکھوالا بننے کے بجائے سیاستدانوں کے ساتھ مل کر دھاندلی کرانے میں مصروف عمل نظر آتا ہے۔ پولیس رشوت لے کر قتل جیسا سنگین جرم کرنے والوں کو بھی بری کر دیتی ہے۔

برصغیر پاک وہند کے مشترکہ تہذیبی معاشرے میں سیاسی تبدیلیوں اور انتشار نے تہذیبی قدروں کو جو نقصان پہنچایا بانو قدسیہ اس کا حال بھی بیان کرتی ہیں مسلم معاشرے کے اندر پائی جانے والی ٹوٹ پھوٹ اور عدم اتحاد انہیں انتشار کا شکار کر دیتا ہے یہ عدم اتحاد ان کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے مسلمان قوم اپنے ہی ہاتھوں اپنی تہذیبی و ثقافتی قدروں کو شکست وریخت کا نشانہ بناتی ہے مسلمان اپنے مذہب اور کلچر کو فروغ دینے کے بجائے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جہاں اپنا مفاد دیکھتے حالات کے مطابق مصلحت پسندی اختیار کر لیتے برصغیر کے مسلمانوں کے نظریات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی ٹکڑوں میں بٹا یہ مسلم معاشرہ اپنی اقدار اور روایات کا خود گلا گھونٹ دیتا ہے۔ بانو قدسیہ مسلم معاشرے کے قدروں کے ٹوٹنے کی بازگشت اور مسلمانوں کی اپنی شناخت کو کھو دینے کے المیے کو بیان کرتی ہیں۔

شہر لازوال، آباد ویرانے میں برصغیر کی تقسیم کے واقعے کے سماج اور ثقافت پر واضح اثرات ملتے ہیں چونکہ بانو قدسیہ نے اس واقعے کو رونما ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لہذا اس واقعے کی چشم دید گواہ ہونے کے ناطے مصنفہ ان حالات و واقعات کو مفصل انداز میں زیر بحث ناول میں پیش کرتی ہیں۔ برصغیر کی تاریخ کا اہم موڑ برصغیر کی تقسیم کا واقعہ محض دو ملکوں کی تقسیم نہیں تھی بلکہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ اس کی تہذیب بھی شکست و ریخت کا شکار ہوئی —

ہجرت کے وقت لوگ جس داخلی کرب سے گزرے اس کا بیان ناول میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ تقسیم کے وقت کے فسادات قتل و غارت عورتوں کا جنسی استحصال ان تمام دل سوز واقعات کا بیان ناول کی کہانی میں پوری جزئیات نگاری کے ساتھ ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے دوران جو حالات و واقعات پیش آئے دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے انسانیت کو بھلا کر معصوم بچوں کا بے دریغ قتل کیا گیا عورتوں کی آبروریزی کی گئی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اس قدر مشکل گھڑی میں جب نہتے لوگوں کا قتل ہو رہا تھا اس وقت کچھ بے ضمیر لوگ لاشوں کی لوٹ مار میں مصروف تھے بعض سفاک لوگ مخلوق خدا کو ختم کرنے کی نیت سے کنویں میں زہر ڈال دیتے ہجرت کے دوران لوگ بے دردی سے قتل کیے گئے جو زندہ بچ گئے وہ ساری زندگی ہجرت کے وقت جس کرب سے دوچار ہوئے نارمل زندگی کی طرف واپس نہیں آسکے۔

ہجرت کے وقت لاکھوں خاندان لٹے پٹے بے آسرا کیمپوں میں پڑے رہے۔ تنہا عورتوں کو دیکھ کر ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا کر ان کے ساتھ جنسی زیادتی کی جاتی اس دوران ایسے بہت سے واقعات درپیش آئے جن میں مذہبی اور سماجی اقدار کا جنازہ نکالا گیا پہلے سے ہی مجبور بے بس عورتوں کو جنسی ہوس کا نشانہ بنا کر مزید دکھ کی بھٹی میں جھونکا گیا—ان حالات میں انسانیت کی بری طرح تذلیل کی جارہی تھی اور روایات و اقدار کی پامالی بھی ہو رہی تھی۔

تقسیم کے واقعہ نے اخلاقی اقدار کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا معاشرتی اقدار اور انسانیت کو بھلا کر لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں مصروف تھے انسانی قدروں کی زوال پذیری نے لوگوں کو ذہنی اور جذباتی شکست و ریخت سے دوچار کیا۔ تقسیم کے نتیجے میں ایک پوری تہذیب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے خود تو اس نئی دھرتی پر آ گئے لیکن اپنی روح برصغیر کے ان علاقوں میں چھوڑ آئے جہاں ان کی ساری زندگی گزری تھی لوگوں کے اندر اپنی تہذیب کو چھوڑنے کا دکھ رچا بسا تھا ہجرت کر کے اپنی زمینوں کو خیر باد کہہ کر ایک بالکل نئی نامانوس تہذیب میں بسنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔

پاکستان کی طرف ہجرت ایک طرح کی جبری منتقلی تھی کیونکہ وہ اپنی تہذیب کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے ان کا کلچر برصغیر میں ہی رہ گیا تھا جس کو وہ ساری زندگی فراموش نہیں کر سکے۔ تقسیم کے بعد وہ لوگ نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو گئے ہجرت کا کرب انہیں داخلی سطح پر بری طرح متاثر کرتا رہا پاکستان آجانے کے بعد نئے ماحول میں یہ ساری عمر رچ بس نہیں سکے ان کے ہاں برصغیر کے شاندار تہذیبی و ثقافتی ورثے سے بچھڑنے کا دکھ اور اپنے سنہری ماضی کی یاد ملتی ہے پاکستان آکر انہیں ہر نعمت میسر آگئی لیکن اپنے بہن بھائیوں والدین دوست جنہیں وہ فسادات کے دوران کھو چکے تھے ان کی یاد ان کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکی یہ ہجرت نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی ہجرت بھی تھی۔

پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے آئے مہاجرین کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ملازمت کے لیے کہیں جاتے تو مہاجر کا لفظ سنتے ہی انہیں وہاں سے بھگا دیا جاتا ہر جگہ مہاجرین کو شک و شبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا انہیں چور ڈاکو سمجھا جاتا اپنی زمین کو چھوڑ دینے کا دکھ اور لوگوں کے اس رویے نے مہاجرین کو مزید ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا مہاجر عورتوں کو لوٹ کا مال سمجھ کر ہر کوئی ان کو شہوانی نظروں سے تکتا کیمپ میں پڑی بے بس لاوارث عورتوں کو پیسے دے کر رات گزارنے کی پیشکش کی جاتی مردوں کی نظریں ان کے جسموں کی پیمائش کرتی راستے سے گزرتا ہر مرد ان کو چھیڑتا آوازیں کستا۔

مہاجرین عورتوں کو پاکستان کے رہائشی اپنے گھروں میں ملازمہ رکھنے کو بھی تیار نہیں تھے لٹی پٹی اجڑی ہوئی ان خواتین کو مرد اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے قابل تو سمجھتے لیکن کوئی بھی ان کو گھر کی عزت بنانے کے لیے تیار نہیں تھا اس معاشرے کے لوگوں کا خیال تھا کہ مہاجرین عورتوں کے اندر وفاداری نہیں پائی جاتی انہیں اپنے گھر میں رکھ بھی لیا جائے تو موقع پاتے ہی گھر کا ساز و سامان لے کر فرار ہو جائیں گی۔

برصغیر پاک و ہند کے مشترکہ معاشرے میں ہندو مسلم صدیوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے ان میں اخذ و انجذاب ہونا ایک فطری عمل تھا ناول کی کہانی میں ہندو مسلم تہذیبوں کا ایک دوسرے پر واضح اثر نظر آتا ہے۔ابتدا میں مسلمان ہندوستان آئے تو مفتوحین کی حیثیت سے آئے مفتوح قوم غالب ہوتی ہے اور اس کی تہذیب و ثقافت بھی غلبہ پاتی ہے۔ پہلے پہل تو مسلمان مفتوحین کی حیثیت سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہوئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندی تہذیب کو اپنانے لگے یہ ایک فطری عمل ہے جب زیادہ عرصے تک دوسری تہذیبوں کی حامل اقوام کے ساتھ رہا جائے تو خود بخود ہی ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور میل جول رکھنے کی وجہ سے ان کی روایات اور رسم و رواج دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں یہی حال مسلمانوں کا ہوا وہ بھی ہندی تہذیب سے متاثر ہونے لگے مسلمانوں کا رہن سہن لباس زبان حتیٰ کہ مذہب بھی ہندی تہذیب سے متاثر ہونے لگا۔

ہندی تہذیب کے واضح اثرات ناول کی کہانی میں مسلم کرداروں کے ہاں نظر آتے ہیں مسلم کردار ہندوانہ لباس پہنتے نہ صرف ان کا لباس بلکہ ان کے نظریات پر بھی ہندی تہذیب غالب تھی مسلم مردانہ کردار عیدین کی نماز پڑھنے مسجد تک نہیں جاتے اپنے مذہب کو مکمل طور پر فراموش کیے ہندی تہذیب میں رچے بسے نظر آتے ہیں مسلمان بچے کھیلوں میں بھی ہندو پنڈتوں کا رول ادا کرتے۔لباس بھی ہندوانہ پہنتے اور کھیل کھیل میں ایسے ڈرامے پیش کرتے جن میں ہندی تہذیب کے کردار تھے۔ مسلم کردار اپنے طور اطوار ملنے جلنے کے آداب میں مکمل طور پر ہندی تہذیب کو اپنائے ہوئے تھے اور ان کی زبان پر بھی ہندی تہذیب کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

ناول میں مسلم کردار ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت کے قصے سناتے نظر آتے ہیں اور خواتین پر بھی ہندی تہذیب کا گہرا اثر ہوا وہ جب کسی سے ملتیں تو السلام و علیکم کہنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر ملتیں توہم پرستی بدشگونی پر یقین رکھتی شادی بیاہ میں بھی مذہب اسلام کی تعلیمات کے مطابق سادگی سے شادی کرنے کے بجائے نمود و نمائش کرتی ناول کی کہانی میں مسلم خواتین بندی لگاتیں ساڑھی پہنتیں اور مندروں میں جاتیں ہوئی نظر آتیں ہیں مسلم نسوانی کردار اپنے شوہر کی وفات پر ہندوؤں کی طرح دوسری شادی کو اچھا نہیں سمجھتی اس کے ذہن پر بھی ہندوانہ خیالات غالب تھے حالانکہ مذہب اسلام میں عقد ثانی کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور اسلام میں بیوہ کا نکاح جائز ہے۔

مسلم خواتین ساڑھی پہنتی ماتھے پر بندی بھی لگاتی اور ہندوؤں کے مذہبی تہوار کڑواچوتھ پر ہندو عورتوں کی طرح مانگ میں سیندور بھرتی۔ کوئی بھی قوم چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک مخلوط معاشرے میں زیادہ عرصہ رہے تو اس کا کلچر خالص نہیں رہتا دوسری تہذیبوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے کلچر میں تبدیلیاں نامعلوم طریقے سے سرایت کر جاتی ہیں کوئی بھی کلچر صرف اس وقت تک ہی خالص رہ سکتا ہے جب کوئی قوم کسی مخصوص جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے دوسری قوموں کے اثرات سے محفوظ رہے۔

مختلف اقوام کے ساتھ زیادہ عرصے تک رہنے کی وجہ سے ایک قوم نامحسوس طریقے سے دوسری قوم کا کلچر اپنا لیتی ہے۔ ہندو قوم بھی صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کا کلچر بڑی حد تک اپنائے ہوئے تھی۔ مسلم اور ہندی تہذیب میں میل جول آٹھویں صدی سے ہی شروع ہو گیا تھا مسلمانوں اور ہندوؤں کے رسم و رواج معاشرت رہن سہن عادات واطوار ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اگر ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں یگانگت نظر آتی ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں نے ہزار ہا برس ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا ہے ناول کے ہندو کردار ملنے جلنے کے آداب میں مسلم تہذیب کو اپنائے ہوئے تھے جب ملتے تو آداب کہہ کر ملتے لبرل ہندو تھے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی گوشت بھی کھا لیتے تھے جب کہ ہندو مذہب میں ماس کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ بول چال میں بھی ہندی زبان کے بجائے اردو زبان بولتے ہندوؤں کی زبان پر اردو زبان کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں جب دو مختلف تہذیبوں کے حامل افراد اکٹھے رہتے ہیں تو ایسے معاشرے میں اخذ و انجذاب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے تہذیبیں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ لیتی اور دیتی رہتی ہیں مسلمان اور ہندو برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئے اور اپنی تہذیب و ثقافت کا کچھ حصہ دیا بھی اور لیا بھی جب زیادہ عرصے تک دو مختلف تہذیبوں کے حامل اقوام اکٹھی رہتی ہیں تو ایک دوسرے کا اثر قبول

کرتی ہیں یہی حال ہندی تہذیب اور مسلم تہذیب کا ہوا برصغیر پاک و ہند میں کئی صدیوں سے ہندو اور مسلمان پڑوسیوں کی طرح اکٹھے رہ رہے تھے دونوں اقوام کے لوگ ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ گئے اس طریقے سے نہ ہندی تہذیب خالص رہ سکی اور نہ ہی مسلم تہذیب۔

ناول مختلف عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے اور ان اجزائے ترکیبی میں ہر عنصر کی جداگانہ اہمیت ہوتی ہے —ناول میں کردار، کہانی، پلاٹ، منظر نگاری اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کسی بھی ناول کی کامیابی میں اس کی زبان بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ناول نگار کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ قاری کی دلچسپی ناول میں برقرار رہے اور قاری اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

ہر مصنف ناول کی زبان کو منفرد بنانے کے لیے ایک مخصوص اور جداگانہ انداز اپناتا ہے یہ انفرادی طرز نگارش ہی مصنف کو باقی مصنفین سے منفرد بناتا ہے مصنف جس ماحول میں پلا بڑھا ہوتا ہے جو تہذیبی اور معاشرتی اثرات اسے ورثے میں ملے ہوتے ہیں جن لوگوں سے وہ متاثر ہوتا ہے اور جن لوگوں کا مطالعہ کر کے اس کے نظریات تشکیل پاتے ہیں ان سب کے مجموعی اثرات سے اس مصنف کا ایک انفرادی طرز نگارش اور لب ولہجہ بنتا ہے۔

بانو قدسیہ اپنا ایک منفرد اور مخصوص اسلوب بیان رکھتی ہیں مصنفہ ایک مشترکہ ہندوستانی معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اپنی زبان پر ہندی زبان کے واضح اثرات لیے ہوئے ہیں۔قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی جیسی ادبی و روحانی شخصیات کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے ان کا لب و لہجہ فلسفیانہ اور روحانی ہو گیا تھا۔بانو قدسیہ کی زبان پر حقیقت نگاری کا عنصر غالب ہے انہوں نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات، تجربات، معاشرتی زندگی، سماجی وسیاسی حالات کو بھی اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔

بانو قدسیہ کی زبان کی خصوصیت خاصہ یہ ہے کہ وہ زبان کو منفرد بنانے کی کوشش کرتی ہیں مصنفہ اپنی افتاد طبع کی بدولت زبان میں نئی نئی تراکیب وضع کرتی رہتی ہیں۔شہر لازوال، آباد ویرانے کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو اس میں تہذیبی و ثقافتی رویوں کا نمایاں اظہار نظر آتا ہے چونکہ بانو قدسیہ کا بچپن ایک مشترکہ ہندوستانی معاشرے میں گزرا تھا لہذا بانو قدسیہ کو ہندی تہذیب قریب سے دیکھنے اور اس میں رہنے کا موقع ملا ناول کی زبان میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب، تاریخ، اس عہد کے سیاسی، سماجی و معاشرتی مسائل، اہم تاریخی واقعات، تہذیب و معاشرت رہن سہن رسم و رواج اور روایات کی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ہندی دیومالائی عناصر اور قصوں کے ذریعے مصنفہ نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا اظہار کیا ہے۔

دھرم سالہ ایک پہاڑی علاقہ جس میں بانو قدسیہ کا بچپن گزرا اس علاقے کی لوک کہانیاں پہاڑوں کے بارے میں مشہور افسانوی قصے ماحول موسم روایات اور اس علاقے کی تاریخ کا تفصیلاً ذکر ناول کی زبان میں ملتا ہے اس علاقے کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے تخیل سے زیادہ حقائق کی تصویر کشی کی ہے اور کمال کی منظر نگاری بھی کی ہے۔

بانو قدسیہ اپنی زبان میں جدت پیدا کرنے کے لئے اس میں نئے نئے مختلف تجربات کرتی رہتی ہیں ناول میں ہمیں جابجا تلمیحات کا استعمال نظر آتا ہے تلمیحات کا یہ استعمال جہاں ناول کی زبان کو انفرادیت بخشتا ہے وہیں کسی بھی تاریخی واقعے کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔ہندی دیومالائی عناصر، ہندی الفاظ، اصطلاحات، جملوں، مذہبی قصوں گیتوں کو استعمال کر کے بانو قدسیہ نے ناول کی زبان میں ایک اچھوتا پن پیدا کیا ہے ان سے نہ صرف ناول کا تسلسل برقرار رہتا ہے بلکہ اسلوب میں جدت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

ناول میں نہ صرف ہندی زبان کا استعمال ہوا ہے بلکہ پنجابی الفاظ گیت شاعری محاورات لوک داستانوں تمثیلی قصوں قدیم زمانے کے واقعات کی بھی بہتات ہے علاوہ ازیں فارسی اور اردو زبان کے محاورات جملے شاعری ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی دل فریبی اور ماہرانہ انداز میں نظر آتا ہے۔

محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال نہ صرف تحریر کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اس سے ہماری قدیم روایات معاشرتی اقدار اور تہذیبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے ان سے نہ صرف تہذیبی و ثقافتی رویوں کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ناول کی زبان بھی مزید دلکش ہو جاتی ہے۔بانو قدسیہ نے نئے نئے محاورات اور تشبیہات روزمرہ کی چیزوں سے وضع کی ہیں ساتھ ہی ساتھ وہ اردو کی مروج تشبیہات و محاورات کا استعمال بھی کرتی نظر آتی ہیں۔

مصنفہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتی تھیں ناول میں بھی انہوں نے انگریزی زبان کے الفاظ کو بڑے احسن طریقے سے برتا ہے انگریزی زبان کو ناول کی کی زبان کا حصہ بناتے وقت کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ شعوری طور پر ان الفاظ کو ناول کے متن میں شامل کر رہی ہیں۔ مصنفہ انگریزی الفاظ کو ہو بہو بھی اور اردو رسم الخط میں بھی ناول کی زبان کا حصہ بناتی ہیں۔

مصنفہ کا انداز معلوماتی اور تفصیلی ہے ہر چیز کی تفصیل کے ساتھ معلومات فراہم کرنے کے بعد ہی وہ ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں یہ تفصیلی گفتگو ناول کی زبان کو خشک بنا دیتی ہے ایجاز و اختصار ہی کسی فن پارے کی خوبی تصور کی جاتی ہے طوالت اکتاہٹ کا شکار کرتی ہے ناول میں کانگڑہ ویلی اور نفس کے بارے میں تفصیلی گفتگو سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔مصنفہ نفسیات میں بہت دلچسپی رکھتی تھیں ناول میں عورت اور مرد کی نفسیات کو بیان کردہ

جملے مصنفہ کے اقوال زریں محسوس ہوتے ہیں- بانو قدسیہ کی زبان پر فلسفیانہ رنگ غالب ہے وہ زیر بحث ناول میں کسی مبلغ کی طرح وعظ و نصیحت کرتے ہوئے قاری کی ذہنی تربیت کرتی دکھائی دیتی ہیں- ناول کی زبان میں منظر نگاری کے ذریعے دیہی علاقوں میں رہنے والوں کا تہذیبی نظام اقدار اور روایات، برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی اقدار، قیام پاکستان کے حالات کی عکاسی، تقسیم کے نتیجے میں تہذیبی اقدار کی شکست وریخت، ہندو اور مسلمانوں کے رسم ورواج شادی بیاہ کے مناظر مذہبی تہوار اور پاکستانی ثقافت کو بڑی جزئیات نگاری سے بیان کیا گیا ہے—

ناول کی زبان کے اظہار میں مختلف تہذیبوں اور مذہبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگیوں کا مطالعہ، اس عہد کے سماجی و معاشرتی حالات کا بیان، مختلف زبانوں کے الفاظ کے استعمال، فلسفہ، انسانی نفسیات کے مطالعے، معاشرے کے گہرے مطالعے اور مصنفہ اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرتے ہوئے کہانی کو ایک تخیلاتی تخلیق کے بجائے ایک حقیقت پر مبنی تخلیق بناتی ہیں بانو قدسیہ کی زبان کو سمجھنے کے لئے قاری کا مختلف زبانوں کا فہم وادراک رکھنا فلسفے اور نفسیات کو سمجھنا ضروری ہے تبھی وہ ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے-

شہر لازوال، آباد ویرانے ایک مختلف نوعیت کا حامل ناول ہے یہ ناول بہت سے چھوٹے چھوٹے قصوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے- ناول کو دو حصوں شہر لازوال اور آباد ویرانے میں تقسیم کیا گیا ہے ان دونوں حصوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے- Paradoxical سطح پر ترتیب دیے گئے اس ناول کو فنی تجربہ سے تعبیر دیا جائے بظاہر یہ ناول کا عیب شمار کیا جائے گا لیکن مصنفہ کے نزدیک یہ ترتیب درست ہو گی-

بانو قدسیہ نے ناول میں متعدد ایسے واقعات بھی شامل کیے ہیں جو محض ناول کی ضخامت کو بڑھاتے ہیں اگر وہ واقعات ناول میں شمولیت نہیں رکھتے تب بھی ناول کی کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا- ان غیر ضروری واقعات کی وجہ سے ناول میں بے جا طوالت کا احساس ہوتا ہے- ان غیر ضروری واقعات کے ساتھ بانو قدسیہ نے بعض کردار ایسے بھی تخلیق کیے ہیں جنہیں اگر وہ خلق نہ بھی کرتی تو چنداں فرق نہیں پڑتا- ان کرداروں کے ناموں کو بانو قدسیہ آپس میں غلط ملط کر دیتی ہیں- غیر ضروری واقعات کی شمولیت اور کرداروں کے آپس میں ناموں کی گڈمڈ سے ناول گنجلک ہو جاتا ہے- ناول کے دوسرے حصے میں عہد بہ عہد واقعات کو تشکیل دیا گیا ہے- ہر عہد کو مزید ذیلی عہدوں میں تقسیم کیا گیا ہے- ان کو بیان کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے بہت زیادہ تفصیلی انداز اپنایا ہے- موضوعات کی پیش کش میں بانو قدسیہ نے تمام واقعات کو ایک ہی جگہ پر بیان کر دیا ہے- ناول میں واقعات کی زمانی ترتیب ایک نئے انداز میں بیان کی گئی ہے- ناول کے پہلے حصے میں قیام پاکستان کے بعد کا پاکستانی معاشرہ دکھایا گیا ہے- ناول کا پہلا حصہ جہاں اختتام پذیر ہوتا ہے

دوسرے حصے میں ان کرداروں کا کوئی تعلق نہیں دکھایا جاتا یہاں بانو قدسیہ واقعات کی ترتیب میں ایک مختلف تجربہ کرتی ہیں ناول میں بانو قدسیہ جابجا کلچر کے بارے میں اپنی ذاتی رائے بھی پیش کرتی ہیں۔

بانو قدسیہ نے مسلمان ادیبہ ہونے کے ناطے مسلمانوں کے عقائد و نظریات اور اہم رکن نماز روزہ زکوۃ کو تفصیلا بیان کیا ہے لیکن مصنفہ ناول میں کہیں پر بھی اپنے مذہب کی طرف داری کرتی اور دوسرے مذاہب کے بارے میں غلط تاثر نہیں دیتی اپنے مذہب سے محبت ان کا فطری عمل ہے اور وہ اسلامی تہذیب کو بہت اچھے طریقے سے بیان کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرے مذاہب کو بیان کرتے وقت کہیں پر بھی ان کے مذہبی رہنماؤں ان کے خداؤں کے بارے میں نظریات ان کی مذہبی عقیدت کو بیان کرتے وقت احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ بغیر کسی مذہبی تفریق کے بانو قدسیہ نے ہر مذہب کے کلچر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ ناول ہر قسم کی متنازع باتوں سے پاک ہے ایک مشترکہ ہندوستانی معاشرے میں رہتے ہوئے بانو قدسیہ کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ہندوؤں کی مسلمانوں سے نفرت انہیں ملیچھ سمجھنا ان حالات کو بانو قدسیہ نے بڑی حقیقت نگاری کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس ناول میں حقیقت نگاری کا عنصر ہی اس کی اثر پذیری میں اضافہ کرتا ہے۔ بانو قدسیہ اپنے ذاتی تجربات واحساسات کو بھی ناول کی کہانی میں جگہ جگہ بیان کرتی نظر آتی ہیں۔

کتابیات

کتابیات

آغا، وزیر- "معنی اور تناظر: مشمولہ کلچر کا مسئلہ- کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۹۷ء-

آغا، وزیر- کلچر کے خدوخال- لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء-

احمد، انوار- "کہانی ماں، بانو قدسیہ کیا نیا ناول" مشمولہ روزنامہ دنیا، راولپنڈی، ۲۳ جنوری ۲۰۱۳ء-

احمد، انوار- بانو قدسیہ: باباصاحبا کی صاحباں- اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ- اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۰ء-

اعظمی، شہاب ظفر- اردو ناول کے اسالیب- دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵ء-

افضل، عفت- بانو قدسیہ: شخصیت اور فن- حیدر آباد: ادارہ انشاء، ۲۰۰۳ء-

بخش، سلطانہ- پاکستانی اہل قلم خواتین- اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۳ء-

بریلوی، عبادت- اقبال کی اردو نثر- علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس-

بیگم، سفینہ- تسطیر، کتاب ۶ (دسمبر)- جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۸ء-

بیگم، سفینہ- تسطیر، کتاب ۶ (دسمبر)- جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۸ء-

بیگم، سفینہ- تسطیر، کتاب ۶ (دسمبر)- جہلم: بک کارنر، ۲۰۱۸ء-

جالبی، جمیل- پاکستانی کلچر- کراچی: مشتاق بک ڈپو، ۱۹۶۴ء-

حسن، سبط- پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء- کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۷۷ء-

رہبر، داؤد- کلچر کے روحانی عناصر- لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء-

سدید، انور- بانو قدسیہ: شخصیت اور فن- اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء-

سید، فرزانہ- نقوش ادب- لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء-

عباد، صفیہ- رشید امجد کے افسانوں کا فنی و فکری جائزہ- اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء-

عبداللہ، سید- کلچر کا مسئلہ- لاہور: علمی پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء-

عمر، محمد- ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر- نئی دہلی: پٹیالہ ہاؤس، ۱۹۷۵ء-

فیض، فیض احمد- "پاکستانی ثقافت" مشمولہ معیار- شمارہ ۱ (۲۰۱۰ء)

قادری، حامد حسن- دبستان تاریخ اردو-کراچی،۱۹۶۶ء-
قدسیہ، بانو- شہر لازوال، آباد ویرانے-لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۷ء-
قریشی، کامل، مرتب- اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب-دہلی: اردو اکادمی،۲۰۰۶ء-
ماہنامہ چہارسو (مارچ)-راولپنڈی ۱۹۹۳ء-
محمود، فیاض- تاریخ ادبیات، مسلمانان پاک و ہند-لاہور: پنجاب یونیورسٹی،۱۹۷۲ء-
یزدانی، خالد- چہرہ نما-لاہور: سید پبلشرز،۲۰۰۷ء-